جلد ۸۱ جون ۱۹۷۴ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تلاش

مطالعہ کے لیے کتاب کی تلاش ہے!

آپ نے تفہیم القرآن کا مطالعہ تو کر لیا!!

لیکن

صاحبِ تفہیم القرآن سے تو بے خبر ہی رہے!!!

"مولانا مودودی"

کا

مطالعہ کیجیے

تحریکِ اسلامی کے عظیم سیرت نگار:

سید اسعد گیلانی

کے قلم سے

خاندانی حالات سے لے کر بین الاقوامی اثرات تک

● ۲۴ ابواب ● صفحات ۵۶۴ ● بڑا سائز ● نفیس کاغذ

● عمدہ کتابت و طباعت ● مضبوط جلد ● قیمت: ۲۲/۵۰

پیشگی رقم بھیجنے والے حضرات کو خرچہ ڈاک فری

چند ابواب

حالاتِ زندگی

مسائل، مسلک، نظریہ

مولانا مودودی اور اربابِ اقتدار

بین الاقوامی شخصیت

عصرِ حاضر کا مفسرِ قرآن

علم و ادب کا مخزن

اقوال اور ارشادات

کارزارِ حیات میں قدم بقدم

وغیرہم

ناشر

مکتبہ تعمیر انسانیت ● گوجر گلی موچی دروازہ ● لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرستِ مضامین

عدد ۴	جون ۱۹۷۴ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ	جلد ۸۱

اشارات — عبدالحمید صدیقی — ۲

دعوتِ اسلامی کی حقیقی نوعیت — ابوالاعلیٰ مودودی — ۹

مقالات

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت قائدِ انقلاب — سید اسعد گیلانی — ۲۲

العلم والایمان — شیخ یوسف القرضاوی، ترجمہ عبدالحمید صدیقی — ۲۹

رسائل و مسائل — تعلیم قرآن اور خدمات دینیہ پر اجرت کا جواز و عدم جواز — ملک غلام علی — ۳۷

مطبوعات — عبدالحمید صدیقی — ۴۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ ۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ ۔ لاہور

زرِ سالانہ دس روپے ۔ فی پرچہ ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا ۔ پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خطرات اگر آنکھوں کے سامنے منڈلا نہ رہے ہوں اور ان کے بارے میں اطلاع دوسروں کی زبان سے مل رہی ہو تو سہل پسند انسان کے لیے خوش فہمی میں گرفتار رہنے کا کسی حد تک جواز پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی قوم کی حالت ایسے مسافروں کی سی ہو جن کی آنکھوں کے سامنے جہاز طوفان کی زد میں آکر ہچکولے کھا رہا ہو اور سمندر کی بپھری ہوئی موجیں اسے ڈبو دینے کے درپے نظر آتی ہوں اور ہر مسافر بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہو کہ جہاز کا عملہ اسے بچانے کے لیے جو تدابیر اختیار کر رہا ہے اس سے اس کا بچاؤ ممکن نہیں اور تدابیر کی ناکامیاں بھی کھل کر سامنے آرہی ہوں تو ان حالات میں کپتان بہادر کی زبانی یقین دہانیاں مسافروں کے اضطراب کو سکون اور اطمینان میں نہیں بدل سکتیں۔ خصوصاً جبکہ انھیں اس بات کا بھی علم ہو کہ کپتان صاحب مسافروں کے جذبات سے کھیلنے میں بڑے ماہر اور مشاق ہیں۔

خدا جانتا ہے کہ ہم قوم کو یاس و قنوطیت کے حوالہ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ پروردگار کی رحمت سے مایوسی کفر ہے جس سے ہر مسلمان پناہ مانگتا ہے لیکن ہم اسے قوم کے ساتھ دغا سمجھتے ہیں کہ اس سے حقیقتِ حال کو چھپایا جائے اور اسے ایسی خوش فہمیوں میں گرفتار رکھنے کا التزام کیا جائے جن کی نوعیت فریب دہی کی سی ہو اور جن کا طلسم اچانک صدمات سے ٹوٹتا رہے۔ قوم کی خیر خواہی کی آخر یہ کون سی قسم ہے کہ دشمن ریاست حیدرآباد کو پوری طرح اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہو اور دنیا کا پریس اور دوسرے ذرائع ابلاغ چیخ چیخ کر اس کی دہائی دے رہے ہوں کہ ریاست ہندو سامراج کے ہاتھوں برباد ہوئی کہ ہوئی لیکن ہم اپنے عوام کو یہ تاثر دیتے رہے کہ آصف شاہی جھنڈا ابھی لال قلعہ پر لہرایا ہی چاہتا ہے اور چند گھنٹوں کے بعد پاکستان کے سادہ دل عوام کو دھماکہ کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ حیدرآباد پر بھارت کا تسلط قائم

ہو چکا ہے۔

ہمارے ملک کے اربابِ اختیار نے شاید اپنے عوام کو دھوکا دینا ہی اپنا سب سے بڑا کمال سمجھ رکھا ہے۔ انہوں نے آج تک کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاتے ہوئے ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ عوام کو اعتماد میں لینے کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ قومی زندگی کے لیے جو مرحلہ جس قدر نازک ہوتا ہے اسی نسبت سے قوم کو اصل حالات سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے درآنحالیکہ قوم سے اس طرح کا شرمناک مذاق کرنے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دورِ جدید میں ذرائع خبر رسانی نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کر لی ہے کہ اب کوئی بھید بھید نہیں رہ سکتا بلکہ بند کمروں میں کی ہوئی انتہائی راز دارانہ باتیں فوراً طشت از بام ہو جاتی ہیں۔ اور جن باتوں کو یہ لوگ اپنے بھائی بندوں سے چھپانے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانوں سے کام لیتے ہیں وہی باتیں غیر ملکی پریس اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع انہیں پوری دنیا میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیلا دیتے ہیں۔

آپ مثال کے طور پر سقوطِ ڈھاکہ کو ہی لے لیجیے۔ ابھی اس المیہ کے رونما ہونے کے بظاہر کوئی آثار نظر نہ آتے تھے کہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹی نے روس کے عزائم اور ان عزائم کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے تھے ان کی نہایت واضح الفاظ میں نشان دہی کر دی اور صاف طور پر بتا دیا کہ مذہب کی بنیاد پر کسی مملکت کا وجود اہلِ مغرب اور خصوصاً اشتراکیت کے علمبرداروں کو کسی طرح بھی گوارا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے وجود سے ان کا قومی شیرازہ بکھرنے کا شدید خطرہ ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ پاکستان میں پوری قوت کے ساتھ انتشار پھیلایا جائے اور وہاں رنگ، نسل اور زبان کے امتیازات کو ابھار کر چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی داغ بیل ڈالی جائے تاکہ "نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر" کا خواب، خوابِ پریشان ثابت ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے روس اور بھارت اور پاکستان کے لادین عناصر نے جو کچھ کیا وہ دنیا کے لیے اب کوئی ڈھکی چھپی داستان نہیں رہی۔ مگر افسوس ہمارے برسرِ اقتدار طبقوں نے اس انتشار کو روکنے کے لیے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا بلکہ ملک کے سارے وسائل اپنے عہدِ اقتدار کو طول دینے میں صرف کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتشار کی چھوٹی چھوٹی چنگاریوں نے خوفناک آگ کی صورت اختیار کر لی۔ مگر ہمارے

حکمران، قوم کو یہ کہہ کر برابر تسلیاں دیتے رہے کہ ان کی قیادت میں ملک ہر طرح سے محفوظ و مامون ہے اور عوام کو ملک اور قوم کے بارے میں فکرمند ہونے کے بجائے مسندِ اقتدار پر براجمان حضرات کی تائید و حمایت کر کے ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔

قوم کو صحیح حالات سے بے خبر رکھنے کی اس سے زیادہ قابلِ افسوس مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ بھارت روس کی تائید کے ساتھ مشرقی پاکستان پر براہِ راست حملہ کرنے کی تیاریاں بالکل مکمل کر چکا تھا اور حالات بڑی تیزی کے ساتھ پاکستان کے لیے بڑی تشویشناک صورت اختیار کر رہے تھے، لیکن ہمارے راہنما ہمیں یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ خطرہ کی کوئی وجہ نہیں۔ پاکستان بھارت کے خلاف ایک ہزار سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ جنگ لڑ سکتا ہے۔ بھارت نے اگر پاکستان پر حملہ کرنے کی حماقت کی تو چین اس کا منہ توڑ دے گا۔ امریکہ فوراً پاکستان کی اعانت اور دستگیری کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑے گا کیونکہ پاکستان کا تحفظ امریکی خارجہ پالیسی کے کونے کا پتھر ہے۔ چنانچہ اس ملک کے سادہ لوح عوام چین اور امریکہ کی عملی امداد کے بل بوتے پر فتح و نصرت کی نوید سننے کے ہی منتظر رہے کہ اچانک یہ منحوس خبر ان پر برق بن کر گری کہ پاکستان کے مشرقی حصہ پر دشمن قابض ہوگیا ہے۔

دنیا میں افراد اور قوموں کو بسا اوقات بڑی بڑی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جو افراد اور قومیں عزت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عزم رکھتی ہیں وہ ان ناکامیوں کو اپنے لیے تازیانۂ عبرت سمجھ کر اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی فکر کرتی ہیں تاکہ وہ اپنی ناکامیوں کو کامرانیوں میں بدل سکیں۔ لیکن جو افراد اور قومیں بلندی کی طرف جانے کا حوصلہ نہیں رکھتیں بلکہ پستی کی طرف لڑھکنے پر بضد ہوتی ہیں وہ اپنی روش میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی لانا پسند نہیں کرتیں بلکہ غلط راہ پر برابر گامزن رہتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا طرزِ عمل اُن قوموں کا سا ہے جن کے اندر اصلاحِ احوال کی کوئی تڑپ باقی نہیں رہی۔ اور جو بار بار کی ٹھوکریں کھا کر سنبھلنے کے بجائے مسلسل گرتے چلے جانے کو اپنا بہت بڑا کارنامہ خیال کرتی ہیں۔ جب کوئی قوم پستی کو ہی رفعت اور بلندی سمجھنے لگے اور ذلت اور ناکامی کو فتح و کامرانی تصور کر کے اس پر خوشی کے شادیانے بجائے اور اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر ندامت محسوس کر کے انہیں دور کرنے کے بجائے انہیں

خوبیاں سمجھ کر اُن پر فخر کرے اور اترائے تو ایسی قوم کا تباہی سے دوچار ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جب کوئی قوم تخریب کی راہ پر گامزن ہوتی ہے تو پہلے اسے چھوٹے چھوٹے صدمات سے دوچار کیا جاتا ہے تاکہ وہ اُس کے لیے تازیانۂ عبرت ثابت ہوں لیکن جب یہ تازیانہ بھی اُسے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں ناکام رہتا ہے، تو پھر خالقِ کائنات اس قوم پر عذاب نازل کر کے اُسے دوسری قوموں کے لیے سامانِ عبرت بناتا ہے۔ دنیا میں کسی قوم کی اس سے بڑی بدقسمتی اور رسوائی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ حوادث سے عبرت پکڑنے کے بجائے دوسری قوم کے لیے سامانِ عبرت بن جائے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے صدمے کے بعد بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ قوم اور اُس کے سربراہ اس روح فرسا حادثے کے بعد اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کریں گے اور جن اسباب کی وجہ سے یہ المیہ رونما ہوا ہے انھیں اِن کے تدارک کی فکر دامن گیر ہوگی مگر افسوس یہ توقعات، توقعات ہی رہیں کسی درجہ پوری نہ ہو سکیں بلکہ جو لوگ حالات کے رُخ کو ذرا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے کے عادی ہیں وہ تو اپنے اس مشاہدہ سے سخت مضطرب اور پریشان ہیں کہ بقیہ پاکستان میں تخریب کا عمل پہلے سے کہیں زیادہ تیز تر ہو گیا ہے۔ پاکستان کی بربادی کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو پانچ اسباب خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں:

- جس اسلام نے پاکستان کو وجود بخشا اور اس کی بقا کا واحد ضامن ہے اس سے افسوسناک حد تک بے اعتنائی۔
- جمہوریت کے نام پر آمریت مسلط کرنے کی کوشش۔
- مغرب کی اندھی تقلید میں غلط معاشی پالیسیوں پر عمل درآمد اور نمائشی کاموں پر دولت کا بے تحاشہ زیاں۔ اس کے نتیجے میں ایک طرف غیر ملکی قرضوں کا بوجھ اور دوسری طرف عوام کی معاشی حالت کا دگرگوں ہونا اور اس طرح پسے ہوئے طبقوں کے اندر شدید احساسِ محرومی کا اُبھرنا۔
- انتظامیہ کو ایک گروہ کے اقتدار کے تحفظ کے لیے بطور آلہ کار استعمال کرنا اور اس طرح اس کا اپنے اصل کام یعنی ملکی انتظام و انصرام سے غافل ہونا اور اقتدار کی دھڑے بندیوں میں براہ راست دخیل ہو کر تخریبی کام سرانجام دینا۔

● حقائق کا سامنا کرنے سے گریز اور ملکی معاملات کو ٹھوس بنیادوں پر حل کرنے کے بجائے عمل کی کمی کو لاف و گزاف سے پورا کرنے کی کوشش اور محض خوش کن باتوں سے عوام کو مسحور کرنے اور اُن پر مستی کی کیفیت طاری رکھنے کی مذموم سعی۔

یہ وہ پانچ اسباب ایسے ہیں جن کا کھوج لگانے کے لیے کوئی زیادہ محنت درکار نہیں۔ پاکستان کا ہر شہری جو تھوڑی بہت سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے وہ اجتماعی زندگی کے مختلف دائروں میں اُن کی تباہ کاریوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ اگر ہمارے ملک کے سربراہ پاکستان کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے دلی طور پر آرزومند ہیں تو پھر انہیں سب سے پہلے اِن اسباب کے تدارک کی فکر کرنی چاہیئے کیونکہ ان کے تدارک کے بغیر پاکستان کو کسی صورت بھی بچایا نہیں جا سکتا۔ ہم یہ بات انتہائی دکھ کے ساتھ کہنے پر مجبور ہیں کہ قوم کی تعمیر نو کا تو بڑا غلغلہ ہے اور اس سلسلے میں اصحاب اقتدار بڑے بلند بانگ دعوے بھی کر رہے ہیں لیکن جن وجوہ کی بنا پر پاکستان پہلے ہی ناقابلِ تلافی نقصان برداشت کر چکا ہے، اِنہیں دُور کرنے کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی جا رہی بلکہ اگر صاف گوئی سے کام لیا جائے تو یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے معاملے میں مجرمانہ تغافل برتا جا رہا ہے اور قوم کو اُس غلط روش پر آگے بڑھنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے جس پر گامزن ہو کر وہ پہلے ہی اپنی عزت، اپنا وقار، اپنا امن اور چین اور اپنے ملک کا نصف حصہ کھو چکی ہے۔

خدا شاہد ہے کہ ہم یہ بات کسی سیاسی دھڑے بندی کی بنا پر یا برسرِ اقتدار طبقے کو بدنام کرنے کی غرض سے نہیں کہہ رہے بلکہ ملک و ملت کی خیر خواہی اور خود اصحاب اقتدار کی خیر خواہی کے جذبے سے ہی عرض کر رہے ہیں کیونکہ ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ جب تک ملک کے اندر تباہ کن رجحانات کو ختم نہ کیا جائے گا، تخریب اور انتشار کا عمل مسلسل جاری رہے گا اور پاکستان کے مزید حصے بخرے ہوتے رہیں گے۔

اس برِ اعظم کے باشندے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے اصحاب بصیرت اس حقیقت سے پوری طرح

واقف ہیں کہ تحریک پاکستان کا خمیر اسلام اور صرف اسلام سے اٹھایا گیا۔ اسلام ہی اس تحریک کا پس منظر اور اساس ہے اور اسلام ہی وہ واحد رشتۂ اخوت ہے جو اس ملک کے باشندوں کے اندر اتفاق اور اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ ایک پنجابی، ایک بلوچی، ایک پٹھان، ایک سندھی اور ایک بنگالی کے مابین دین کے اشتراک کے علاوہ اور کونسی ایسی قدر مشترک ہے جو انھیں ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔ ان کی بولیاں ایک دوسرے سے الگ، ان کے رنگ جدا جدا اور ان کی عادات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، حتّٰی کہ مغرب اور مشرق کے مابین ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ حائل تھا، لیکن رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود کے وسیع اختلافات کے باوجود اسلام کی مقناطیسی کشش نے پاکستانی قوم کے ان مائل بہ انتشار اجزاء کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔ دین حق نے پاکستان اور پاکستانی قوم کو ایک مضبوط بنیاد عطا کی ہے، اسی سے اس کا اجتماعی ہیولیٰ تیار ہوا ہے اور اسی کی بدولت اس کی جغرافیائی حدود متعین ہوئی ہیں۔ دوسری قوموں کے لیے مذہب روحانی سکون، اخلاقی ضابطۂ حیات یا ایک حد تک تاریخی پس منظر فراہم کرتا ہے، لیکن مسلم قوم کے لیے دین حق غایت الغایات اور مدارِ حیات ہے اور پاکستان کے معاملے میں تو تاریخی پس منظر کے علاوہ ملک کا جغرافیہ بھی اسی دین کا رہینِ منت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو نظریہ کسی قوم کے لیے جوہرِ حیات کی حیثیت رکھتا ہو اس کے معاملے میں کوئی ہوشمند قوم غفلت اور لاپرواہی کا رویہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی لیکن صد افسوس کہ ہم نے مسلم قوم کی قوت و طاقت کے اس سرمدی سرچشمے کے بارے میں بڑا تکلیف دہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ جب عوام کے جذبات سے کھیلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو تقریروں اور بیانات میں اسلام سے والہانہ عقیدت اور شیفتگی کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ لیکن دنیائے عمل میں اسلام کے مطابق کوئی قدم نہیں اُٹھایا جاتا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی دین حق کے انقلاب انگیز اثرات سے یکسر عاری ہے۔ اگر مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین دین کے رشتے کو صحیح معنوں میں مضبوط بنانے کی کوشش کی جاتی اور دینِ حق کو بازیچۂ اطفال نہ بنایا جاتا تو کیا کبھی یہ ممکن تھا کہ دو دینی بھائی زبان، رنگ، نسل کے اختلافات کی بنا پر اور معاشی مفادات کی خاطر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے۔ ہمارے برسرِ اقتدار طبقوں کی غفلت کی وجہ سے چونکہ اسلام کا رشتہ ہر آن کمزور ہوتا گیا اس لیے جاہلی تعصبات نے زور پکڑا اور انھوں نے ہماری قوم کے رگ و پے میں منافرت کا زہر بھر دیا جس کی بنا پر بھائی نے بھائی کا گلا

کاٹا، بھائیوں نے بہنوں کی عصمت دری کی اور ہنود و یہود کی شہ پا کر ایک خدا اور ایک رسول اور ایک دین کے ماننے والوں اور پاکستان کے قیام کے لیے ایک دوسرے کے ہم عنان ہو کر جد و جہد کرنے والوں نے آپس میں ایسی قساوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا کہ اگر اسے درندوں کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ بھی شاید شرم کے مارے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ چرخ نیلی فام نے اس سے بڑا حزنیہ اور کیا دیکھا ہوگا کہ توحید پرستوں کی ایک بہت بڑی جمعیت نے مسلمانوں سے کٹ کر اپنے آپ کو اس ہندو سامراج کی تحویل میں دے دیا جس کی قہرمانیوں اور ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے اس نے پچیس برس بیشتر پاکستان کی صورت میں ایک الگ خطۂ ارضی کے حصول کے لیے اس کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ آخر یہ اندوہناک صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی، دشمن کو ہمارے جسد میں منافرت کا زہر پھیلانے کا کیوں موقع ملا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ برسرِ اقتدار طبقوں کی غلط روش نے اسلام دشمن طاقتوں کو کھل کھیلنے کے پورے مواقع فراہم کیے اور انہوں نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دینی جذبات اور احساسات کو سرد کر کے ان کی جگہ نسلی اور لسانی تعصبات کی آگ بھڑکا دی جس نے ہماری اجتماعیت کو خاکستر کر کے رکھ دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے مشرقی حصے پر ہندو کا تسلط ہماری قومی زندگی کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے لیکن ہم اس حادثہ پر اس قدر دل گرفتہ اور پریشان نہ ہوتے اگر ہمیں بچے کھچے پاکستان میں حالات کسی اعتبار سے بھی روبہ اصلاح نظر آتے اور ہم محسوس کرتے کہ تشتّت و افتراق کے جو عوامل پاکستان کو پہلے شدید نقصان پہنچا چکے ہیں اُن عوامل کو نہ صرف مغربی پاکستان میں بے اثر بنا دیا جائے گا بلکہ ان تخریبی عوامل کی جگہ ایسے عوامل کو بروئے کار لایا جائے گا جس سے باقی ماندہ پاکستان کے بسنے والوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہوگی مگر ہر دردمند پاکستانی کی آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں وہ جب یہ دیکھتی ہیں کہ یہاں اتفاق و اتحاد کے اس مجرب نسخے کے مطابق کوئی عمل نہیں کیا جا رہا بلکہ انتشار کی قوتیں اس حصے میں پہلے سے زیادہ سرگرم عمل ہیں۔ ملک کے ذرائع ابلاغ پر عملاً ان لوگوں کا قبضہ ہے جو اشتراکیت یا لادینیت کے علمبردار ہیں اور جو ایک طے بندھے منصوبے کے تحت علاقائی کلچر اور علاقائی بولیوں کی ترقی کی آڑ میں ملک کے مختلف حصوں میں منافرت کے بیج بو رہے ہیں

دعوتِ اسلامی کی حقیقی نوعیت

(۳)

توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید

(۵) توحید کے تقاضے | توحید کو حق اور شرک کو ہر لحاظ سے باطل ثابت کرنے کے ساتھ قرآن میں یہ بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کو رب اور معبود ماننے کے بعد لازم کیا آتا ہے:

(۱) اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت اور پرستش نہ کی جائے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات - ۵۶)	میں نے جن اور انسانوں کو (کسی اور کی عبادت کے لیے نہیں بلکہ) اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔
لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ [1] (حٰم السجدۃ ۳۷)۔	نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔
اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر ۲-۳)	اے محمدؐ، ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف برحق نازل کی ہے لہٰذا تم اللہ ہی کی عبادت کرو دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔ خبردار رہو دین خالص اللہ ہی کا حق ہے۔

[1] یہ آیت سجدہ ہے۔ اسے پڑھ کر سجدہ کر لیا جائے۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ	کہہ دو کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	کہ اُن کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ
(المومن - ۶۶)	کر پکارتے ہو ۔

(۲) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگی جائے کسی کو فوق الفطری SUPERNATURAL طور پر حاجت روا اور کارساز سمجھ کر اُس سے اپنی حاجات میں مدد نہ مانگی جائے:

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ	(اے اللہ، تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں
(الفاتحہ)	اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں[۱]
وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا	اور اللہ کے سوا کسی اور کو مدد کے لیے
لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ	نہ پکارو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ
(یونس - ۱۰۶)	نقصان ۔
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ	اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مدد
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔	کے لیے نہ پکارو ۔ کوئی حقیقی معبود اس کے
(القصص - ۸۸)	سوا نہیں ہے ۔
وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ	اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو، میں
لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ	تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں
عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ	آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل و
دٰخِرِیْنَ (المومن - ۶۰)۔	خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے[۲]

---

[۱] ایک مدد وہ ہے جو دنیا کے مادّی قوانین کے تحت ایک شخص کسی دوسرے شخص کسی یا چیز یا ادارے سے مانگتا ہے ۔ یہ توحید کے خلاف نہیں ۔ توحید کے خلاف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ غیبی طور پر ہماری دعائیں سنتا ہے اور یہ خیال کرتے ہوئے اس سے مدد مانگی جائے کہ عالمِ اسباب پر اس کی حکمرانی ہے یا حکمرانی میں اُس کا کوئی حصہ ہے اور عام مادّی اسباب سے بالاتر طریقے پر وہ ہماری حاجتیں پوری کر سکتا ہے ۔

[۲] اس آیت سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دعا اور عبادت کی حقیقت ایک ہی ہے ۔ جو شخص کسی سے دعا مانگتا ہے وہ درحقیقت اس کی عبادت کرتا ہے ۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ - ۱۸۶)	اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو میں قریب ہی ہوں[1]، دعا مانگنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا کا جواب دیتا ہوں[2]۔

(۳) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا عالم الغیب کسی کو نہ مانا جائے۔ کسی دوسرے کے متعلق یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ کائنات کی تمام پوشیدہ اور ظاہر حقیقتوں کو جانتا ہے اور ماضی سے مستقبل تک ہر چیز کا اُسے علم ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل - ۶۵)	کہو، آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں ان میں سے کوئی بھی غیب کا علم اللہ کے سوا نہیں رکھتا۔
وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام - ۵۹)	اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے اُسے وہی جانتا ہے۔ کسی درخت کا ایک پتہ بھی جھڑتا ہے تو وہ اسے جانتا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے جو ایک واضح دفتر میں درج نہ ہو۔

(۴) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے نام پر یا کسی آستانے پر کوئی جانور ذبح یا قربان نہ کیا جائے، اور ہر ایسا جانور حرام ہو جسے ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام نہ لیا جائے، یا اللہ کے ساتھ کسی اور

---

[1] یعنی مجھ سے دعا مانگنے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں براہِ راست دعا سنتا ہوں۔

[2] جواب سے مراد ایسا جواب نہیں ہے جو دعا مانگنے والا بھی سُنے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمام درخواستوں پر جوابی کارروائی میں ہی کرتا ہے۔

کا بھی نام لیا جائے۔ قرآن میں ۴ مقامات پر صاف صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو وہ حرام ہے (البقرہ — ۱۷۳ — المائدہ — ۳ — الانعام — ۱۴۵ — النحل — ۱۱۵)۔ سورۂ مائدہ میں یہ بھی تصریح ہے کہ غیر اللہ کے لیے نذر کے طور پر قربانیاں چڑھانے کے لیے جو آستانے مشرکین نے بنا رکھے تھے ان پر ذبح کیا ہوا جانور بھی حرام ہے (آیت ۳)۔ پھر سورۂ انعام میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا:

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ (آیت ۱۱۸)۔	پس کھاؤ اُس جانور کے گوشت میں سے جس پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔
وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (آیت ۱۲۱)۔	اور نہ کھاؤ کسی ایسے جانور کے گوشت میں سے جس پر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو کیونکہ یہ فسق ہے۔

(۵) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو خدا ساری کائنات کی حاکمیت و اقتدار کا لاشریک مالک ہے اُسی خدا کی حاکمیت اور اُسی کے اقتدار اعلیٰ کو جملہ انسانی معاملات (اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، عدالت اور صلح وجنگ وغیرہ) میں بھی تسلیم کیا جائے۔ اسی کا قانون، قانون ہو، کسی دوسرے کو اس کے مقابلے میں قانون سازی کا اختیار نہ ہو۔ اسی کا حرام کیا ہوا حرام اور اسی کا حلال کیا ہوا حلال ہو، کسی کو یہ حق نہ ہو کہ بطور خود حلال و حرام تجویز کرے۔ انسان بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت نہ خود مختار بن کر اپنی مرضی چلائے، اور نہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کی مرضی کا قانون و قاعدہ تسلیم کرے۔ انسانی معاملات میں فیصلہ کا اختیار اللہ کو ہو نہ کہ بندوں کو۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللهِ (الشوریٰ — ۱۰)	تمہارے درمیان جس چیز میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔
أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللهُ (الشوریٰ — ۲۱)	کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والی ایسی شریعت مقرر کر دی ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا ہے؟

"اس آیت کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں شریکوں سے مراد وہ شریک نہیں

ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، جن کے آگے پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں، بلکہ لامحالہ ان سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، اور جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور رواجات کو اپنے مذہبی مراسم، اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدن میں اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں اور اپنی سیاست اور حکومت اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی اُن کو کرنی چاہیئے" (تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۳۸)

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ ، سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ - ۳۱) -

انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی ۔ حالانکہ ان کو ایک خدا کے سوا کسی کی بندگی کا حکم نہیں دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں ۔ پاک ہے وہ اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ۔

" حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدیؓ بن حاتم، جو پہلے عیسائی تھے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تو انہوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ اس آیت میں ہم پر اپنے علماء اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ وہ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے ہو اور جو کچھ وہ حلال قرار دیتے ہیں اسے حلال مان لیتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا یہ تو ضرور ہم کرتے رہے ہیں ۔ فرمایا بس یہی ان کو خدا مان لینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہوتے ہیں اور جو ان کے اس حقِ شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انہیں

خدا بناتے ہیں۔"

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۔ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ۔
(یونس - ۵۹)۔

اے نبیؐ، اِن سے کہو تم نے کبھی سوچا بھی کہ سامانِ زیست اللہ نے تمہارے لیے نازل کیا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا؟ ان سے پوچھو کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (النحل - ۱۱۶)۔

اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگاتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ..... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ...... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ
(المائدہ - ۴۴ - ۴۵ - ۴۷)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں..... وہی ظالم ہیں...... وہی فاسق ہیں۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ
(الجاثیہ - ۲۳)۔

پھر تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا (یعنی خود مختار بن گیا اور اپنے نفس کی بندگی کرنے لگا)۔

اِس طرح وہ توحید جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے تھے اس کا تقاضا صرف یہی نہ تھا کہ لوگ خدائے واحد کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، کسی سے دعا نہ مانگیں، کسی کے لیے قربانیاں نہ کریں، بلکہ یہ بھی تھا کہ لوگ اپنے تمام رسمی اور رواجی قاعدوں، اور تمام خود ساختہ یا دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین اور ضوابط کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو قانون دینے والا مانیں اور اسی کے دیے ہوئے قانون کی پیروی

کریں۔ اس معاملہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کوئی استثناء نہ تھا۔ آپ کو بھی یہ حکم تھا کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کا اتباع کریں اور اپنی مرضی سے خود کسی چیز کو حلال یا حرام نہ کریں۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (الانعام۔ ۱۰۶)۔

اے محمدؐ، پیروی کرو اُس چیز کی جو بذریعہ وحی تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے بھیجی گئی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (التحریم۔ ۱)۔

اے نبیؐ، تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟

یہ گویا ایک ہمہ گیر انقلاب کی دعوت تھی جو صرف مذہب ہی کو نہیں بلکہ پورے نظام زندگی کو بدل ڈالنا چاہتی تھی۔ اِس سے مشرکین عرب میں تو کھلبلی مچنی ہی تھی، مگر خاص طور پر قریش کے مفاد پر اس کی جو شدید ضرب پڑتی تھی اس پر وہ تلملا اُٹھے، کیونکہ خود ان کے قبیلے اور ان کے اپنے شہر سے اس دعوت کے اُٹھنے میں اُن کو اپنی صریح تباہی نظر آتی تھی

قریش کی مخالفت کی بڑی اور بنیادی وجہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ قریش کے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے میں جو خطرہ نظر آتا تھا وہ یہ تھا:

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (القصص۔ ۵۷)۔

وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے کفر و انکار کا سب سے اہم بنیادی سبب یہی تھا۔ اس بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ تاریخی طور پر اس زمانے میں قریش کی پوزیشن کیا تھی جس پر ضرب پڑنے کا انہیں اندیشہ تھا۔

قریش کو ابتداءً جس چیز نے عرب میں اہمیت دی وہ یہ تھی کہ ان کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا انساب عرب کی رُو سے بالکل ثابت تھا اور اس بناء پر اُن کا خاندان عربوں کی نگاہ میں پیرزادوں کا خاندان تھا۔ پھر جب قُصَیّ بن کلاب کے حُسنِ تدبیر سے یہ لوگ کعبہ کے متولی ہوگئے اور مکّہ ان کا مسکن بن گیا تو ان کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی۔ اس لیے کہ اب وہ

عرب کے سب سے بڑے "تیرتھ"[1] کے مجاور تھے۔ تمام قبائلِ عرب میں ان کو مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل تھا اور حج کی وجہ سے عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو اُن سے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ اس مرکزی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر قریش نے بتدریج تجارتی ترقی شروع کی اور خوش قسمتی سے روم و ایران کی سیاسی کشمکش نے ان کو بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مقام عطا کر دیا۔ اس زمانے میں روم و یونان اور مصر و شام کی جتنی تجارت بھی چین، ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ کے ساتھ تھی اُس کے سارے ناکے ایران نے روک دیئے تھے۔ آخری راستہ بحرِ احمر کا رہ گیا تھا۔ سومین پر ایران کے قبضہ نے اسے بھی روک دیا۔ اس کے بعد کوئی صورت اِس تجارت کو جاری رکھنے کے لیے اس کے سوا نہیں رہ گئی تھی کہ عرب کے تاجر ایک طرف رومی مقبوضات کا مال بحرِ عرب اور خلیج فارس کے بندرگاہوں پر پہنچائیں اور دوسری طرف اُنھی بندرگاہوں سے مشرقی اموالِ تجارت لے کر رومی مقبوضات میں پہنچیں۔ اس صورتِ حال نے مکّہ کو بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ اُس وقت قریش ہی تھے جنھیں اِس کاروبار کا اجارہ حاصل تھا۔ لیکن عرب کی طوائف الملوکی کے ماحول میں یہ تجارتی نقل و حرکت اس کے بغیر نہ ہو سکتی تھی کہ تجارتی شاہراہیں جن قبائل کے علاقوں سے گذرتی تھیں ان کے ساتھ قریش کے گہرے تعلقات ہوں۔ سردارانِ قریش اس غرض کے لیے صرف اپنے مذہبی اثر پر اکتفا نہ کر سکتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے تمام قبائل کے ساتھ معاہدات کر رکھے تھے۔ تجارتی منافع میں سے بھی وہ اُن کو حصّہ دیتے تھے۔ شیوخِ قبائل اور با اثر سرداروں کو تحائف و ہدایا سے بھی خوش رکھتے تھے اور سودی کاروبار کا بھی ایک جال انھوں نے پھیلا رکھا تھا جس میں قریب قریب تمام ہمسایہ قبائل کے تجّار اور سردار جکڑے ہوئے تھے۔

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید اُٹھی تو دینِ آبائی کے تعصب سے بھی بڑھ کر جو چیز قریش کے لیے اُس کے خلاف وجہ اشتعال بنی وہ یہ تھی کہ اِس دعوت کی بدولت اُنھیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجّتوں سے شرک و بت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اُس کو چھوڑنا اور اِسے قبول کر لینا ہمارے لیے تباہ کن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اُٹھے گا۔ ہمیں کعبہ کی تولیت سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ بت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام معاہدانہ تعلقات

[1] مراد یہ ہے کہ قریش نے اللہ کے مقدس گھر کو ایک بت خانے اور تیرتھ کی شکل دے رکھی تھی (مرتبین)

ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصوں سے گزرتے ہیں۔ اس طرح یہ دین ہمارے مذہبی رسوخ و اثر کا بھی خاتمہ کر دے گا اور ہماری معاشی خوشحالی کا بھی۔ بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائلِ عرب ہمیں سرے سے مکہ ہی چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔

یہاں پہنچ کر دنیا پرستوں کی بے بصیرتی کا عجیب نقشہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار انھیں یقین دلاتے تھے کہ یہ کلمہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اسے مان لو تو عرب و عجم تمہارے تابع ہو جائیں گے۔ مگر انہیں اس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو دولت، اثر، رسوخ ہمیں آج حاصل ہے یہ بھی اس دعوت کو ماننے سے ختم ہو جائے گا کجا کہ عرب و عجم ہمارے تابع ہوں۔ ان کو اندیشہ تھا کہ یہ کلمہ قبول کرتے ہی ہم اس سرزمین میں ایسے بے یار و مددگار ہو جائیں گے کہ جیل کوّے جس طرح گوشت اُچک لے جاتے ہیں اُسی طرح ہم اس سرزمین سے اُچک لیے جائیں گے اور ہمارا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ اُن کی کوتاہ نظری وہ وقت نہ دیکھ سکتی تھی جب چند ہی سال بعد تمام عرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت ایک مرکزی سلطنت کا تابعِ فرمان ہونے والا تھا، پھر اُسی نسل کی زندگی میں ایران، عراق، شام، مصر، سب ایک ایک کر کے اس سلطنت کے زیرِ نگیں ہو جانے والے تھے، اور اس قول پر ایک صدی گزرنے سے بھی پہلے قریش ہی کے خلفاء سندھ سے لے کر اسپین تک اور قفقاز سے لے کر یمن کے سواحل تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر حکمرانی کرنے والے تھے۔

اُن کے اس عذر پر قرآن کا جواب | قرآن مجید میں ان کے اس عذر کا جو مفصل جواب اسی سورۂ قصص میں دیا گیا اُسے دیکھیے کہ وہ کتنا اثر انگیز تھا۔ فرمایا:

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (القصص۔ ۵۷)۔	کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پُرامن حرم کو ان کے لیے ایک جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے عذر کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن و امان اور جس کی مرکزیت کی بدولت آج تم اس قابل ہوئے ہو کہ دنیا بھر کا مالِ تجارت اس وادیٔ غیرِ ذی زرع میں کھچا چلا آ رہا ہے، کیا اس کو یہ امن اور یہ مرکزیت کا مقام تمہاری کسی تدبیر نے دیا ہے؟ ڈھائی ہزار برس

پہلے چٹیل پہاڑوں کے درمیان اِس بے آب وگیاہ وادی میں ایک اللہ کا بندہ اپنی بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو لے کر آیا تھا۔ اس نے یہاں پتھروں پر پتھر رکھ کر ایک حجرہ تعمیر کر دیا اور پکار دیا کہ اللہ نے اِسے حرم بنایا ہے آؤ اس گھر کی طرف اور اس کا طواف کرو۔ اب یہ اللہ کی دی ہوئی برکت نہیں تو اور کیا ہے کہ ۲۵ صدیوں سے یہ جگہ عرب کا مرکز بنی ہوئی ہے، سخت بدامنی کے ماحول میں ملک کا صرف یہی گوشہ ایسا ہے جہاں امن میسر ہے، اس کو عرب کا بچہ بچہ احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر سال ہزارہا انسان اس کے طواف کے لیے چلے آتے ہیں۔ اِسی نعمت کا ثمرہ تو ہے کہ تم عرب کے سردار بنے ہوئے ہو اور دنیا کی تجارت کا ایک بڑا حصہ تمہارے قبضے میں ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے یہ نعمت تمہیں بخشی ہے، اس سے منحرف اور باغی ہو کر تو تم پھلو پھولو گے، مگر اس کے دین کی پیروی اختیار کرتے ہی برباد ہو جاؤ گے؟

پھر فرمایا:

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ	اور کتنی ہی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن
مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ	کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ
تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا	لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان
وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ	کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔ آخر کار ہم ہی وارث
(القصص - ۵۸)۔	ہو کر رہے۔

یہ اُن کے عذر کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال و دولت اور خوشحالی پر تم اترائے ہوئے ہو اور جس کے کھوئے جانے کے خطرے سے تم باطل پر جمنا اور حق سے منہ موڑنا چاہتے ہو، یہی چیز کبھی عاد اور ثمود اور سبا اور مدین اور قومِ لوطؑ کے لوگوں کو بھی حاصل تھی۔ پھر کیا یہ چیز ان کو تباہی سے بچا سکی؟ آخر معیارِ زندگی کی بلندی ہی تو ایک مقصود نہیں ہے کہ آدمی حق و باطل سے بے نیاز ہو کر بس اُسی کے پیچھے پڑا رہے اور راہِ راست کو صرف اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دے کہ ایسا کرنے سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔ کیا تمہارے پاس اِس کی کوئی ضمانت ہے کہ جن گمراہیوں اور بدکاریوں نے پچھلی خوشحال قوموں کو تباہ کیا انہی پر اصرار کر کے تم بچے رہ جاؤ گے اور ان کی طرح تمہاری شامت کبھی نہ آئے گی۔

آگے فرمایا:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (القصص - ۵۹)

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ اُن کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دے جو ان کو ہماری آیات سناتے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔

یہ ان کے عذر کا تیسرا جواب ہے۔ پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں ان کے لوگ ظالم ہو چکے تھے، مگر خدا نے ان کو تباہ کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیج کر انہیں مُتَنَبِّہ کیا، اور جب ان کی تنبیہ پر بھی وہ اپنی کج روی سے باز نہ آئے تو انہیں ہلاک کر دیا۔ یہی معاملہ اب تمہیں درپیش ہے۔ تم بھی ظالم ہو چکے ہو، اور ایک رسول تمہیں بھی متنبہ کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اب تم کفر و انکار کی روش اختیار کر کے اپنے عیش اور اپنی خوشحالی کو بچا نہ لو گے بلکہ اُلٹا خطرے میں ڈالو گے۔ جس تباہی کا تمہیں اندیشہ ہے وہ ایمان سے نہیں بلکہ انکار کرنے سے آئے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۔

(القصص آیت ۶۰-۶۱)

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟

یہ ان کے عذر کا چوتھا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہئیں۔

اوّل یہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی، جس کی مقدار کسی کے لیے بھی چند سالوں سے زیادہ نہیں ہوتی، محض ایک سفر کا عارضی مرحلہ ہے۔ اصل زندگی جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، آگے آنی ہے۔ موجودہ عارضی زندگی میں انسان خواہ کتنا ہی سروسامان جمع کر لے اور چند سال کیسے ہی عیش کے ساتھ بسر کر لے، بہرحال اسے ختم ہونا ہے اور یہاں کا سب سروسامان آدمی کو یونہی چھوڑ کر اُٹھ جانا ہے۔ اس عیش کے مقابلے میں ایک عقل مند اس کو ترجیح دے گا کہ یہاں چند سال مصیبتیں بھگت لے، مگر یہاں سے وہ بھلائیاں کما کر لے جائے جو لبعد کی دائمی زندگی میں اس کے لیے ہمیشگی کے عیش کی موجب بنیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اس دنیا کی متاعِ حیات سے استفادہ نہ کرے اور اس کی زینت کو خواہ مخواہ لات ہی مار دے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کا عیش کم تر اور آخرت کا عیش بہتر۔ اس لیے دنیا کی وہ متاع اور زینت تو آدمی کو ضرور حاصل کرنی چاہیئے جو آخرت کی باقی رہنے والی زندگی میں سُرخرو کرے، یا کم از کم یہ کہ اسے وہاں کے ابدی خسارے میں مبتلا نہ کرے۔ لیکن جہاں معاملہ مقابلے کا آپڑے، یعنی دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامیابی ایک دوسرے کی ضد ہو جائیں، وہاں دینِ حق کا مطالبہ انسان سے یہ ہے، اور یہی عقل سلیم کا مطالبہ بھی ہے، کہ آدمی دنیا کو آخرت پر قربان کر دے اور اِس دنیا کی عارضی متاع و زینت کی خاطر وہ راہ ہرگز اختیار نہ کرے جس سے ہمیشہ کے لیے اس کی عاقبت خراب ہوتی ہو۔

ان دو باتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیئے کہ اللہ اوپر کے فقروں میں کفارِ مکہ سے کیا فرما رہا ہے۔ وہ یہ نہیں فرماتا کہ تم اپنی تجارت لپیٹ دو، اپنے کاروبار ختم کر دو، اور ہمارے پیغمبر کو مان کر فقیر ہو جاؤ۔ بلکہ وہ یہ فرماتا ہے کہ یہ دنیا کی دولت جس پر تم ریجھے ہوئے ہو، بہت تھوڑی دولت ہے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے تم اس کا فائدہ اِس حیاتِ دنیا میں اُٹھا سکتے ہو۔ اس کے برعکس اللہ کے ہاں جو کچھ ہے وہ اس کی نسبت کم و کیف (QUANTITY اور QUALITY) میں بھی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی ہے۔ اس لیے تم سخت حماقت کرو گے اگر اس عارضی زندگی کی محدود نعمتوں سے متمتع ہونے کی خاطر وہ روش اختیار کرو جس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کی شکل میں تمہیں بھگتنا پڑے۔ تم خود مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ کامیاب آیا وہ شخص ہے جو محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے رب کی خدمت بجا لائے اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے انعام سے سرفراز ہو، یا وہ شخص جو گرفتار ہو کر مجرم کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کیا جانے والا ہو اور گرفتاری سے

پہلے محض چند روز حرام کی دولت سے مزے لوٹ لینے کا اس کو موقع مل جائے؟

آخر میں فرمایا:

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ (القصص - ۶۲)	"اور بھول نہ جائیں یہ لوگ، اس دن کو جب کہ وہ اِن کو پکارے گا اور پوچھے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے۔"

یہ تقریر بھی اسی چوتھے جواب کے سلسلے میں ہے، اور اس کا تعلق اُوپر کی آیت کے آخری فقرے سے ہے۔ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محض اپنے دنیوی مفاد کی خاطر شرک و بت پرستی اور انکارِ نبوّت کی جس گمراہی پر یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں، آخرت کی ابدی زندگی میں اس کا کیسا بُرا نتیجہ انھیں دیکھنا پڑے گا۔ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ فرض کرو دنیا میں تم پر کوئی آفت نہ بھی آئے، اور یہاں کی مختصر سی زندگی میں تم حیاتِ دنیا کی متاع و زینت سے خوب بہرہ اندوز بھی ہو لو، تب بھی اگر آخرت میں اس کا انجام یہی کچھ ہونا ہے تو خود سوچ لو کہ یہ نفع کا سودا ہے جو تم کر رہے ہو یا سراسر خسارے کا سودا؟

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت

قائدِ انقلاب

از جناب سید اسعد گیلانی

حضورؐ حقیقی قائدِ انقلاب تھے۔ انہوں نے دنیا کی تشکیل کا پرانا ڈھانچہ یکسر بدل دیا اور دنیا کو سب کچھ نیا دیا۔ حضورؐ نے دنیا کو ایک نیا نظام، نیا معاشرہ، نیا ضابطہ، اور نیا انسان دیا۔ ایسا نیا انسان جو اللہ کی خوشنودی کا مظہر اور اس کی بندگی اور عبادت کی علامت ہے، جسے مسلمان کہتے ہیں اور جس کا نام ہی اطاعتِ الٰہی کا نشان ہے۔ ظلمتوں، تاریکیوں اور گمراہیوں سے بھری ہوئی دنیا میں سرورِ کائنات کا وجود ایک روشنی کا مینار ہے۔ انسانیت کا قافلہ مجبور ہے کہ راہِ راست کی تلاش میں اس مینار سے روشنی کی بھیک طلب کرے۔ ہر چشمِ بصیرت کو، غیر متمدن دنیا اپنی تمام کمزور خیالیوں کے ساتھ حضورؐ کے عقب میں گم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور نئی دنیا اور نیا نظام حضورؐ کے قدموں سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پرانی دنیا کو حضورؐ نے اپنے تیئس سالہ جہادِ زندگانی میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے علم و عقل کی روشنی میں دمادم مہذب اور متمدن ہونے والی دنیا کا افتتاح آپؐ نے فرمایا اور اسے ایک ایسا نظام عطا کیا جو ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور ہر زمان کی انسانی ضرورتوں کا کفیل ہے۔

دنیا میں کچھ لوگوں نے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں کہ ان کی یاد ذہن انسانی سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے اور تاریخ نے ان کے کارناموں کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔ بڑے بڑے سالاروں کی یلغاریں، بڑے بڑے فاتحوں کی فتوحات، بڑے بڑے حکیموں کی حکمتیں اور دانائیاں اور بڑے بڑے فلسفیوں کے فلسفے بڑے بڑے عالموں کے علم و ادب کے ذخیرے اور بڑے بڑے سائنسدانوں کی ایجادات، وطن پرستوں کی جانفشانیاں اور قوم پرستوں کی قربانیاں تاریخ کے دامن میں سے نکل نکل کر نسل انسانی کے سامنے آتی ہیں اور اپنے لیے تحسین و آفرین کے تحفے طلب کرتی ہیں۔ لیکن اگر ان کے مجموعی کارناموں کو فلاحِ انسانیت کے عالمگیر ترازو میں رکھ کر تولا جائے تو ان کی بے وزنی اور بے وقعتی بہت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ بڑے بڑے آمروں، فاتحوں اور سالاروں نے زیادہ سے زیادہ بس یہی کیا کہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو غلام بنایا، بڑے بڑے حکیموں کی حکمتیں

اور داناؤں کی دانائیوں نے دنیا کے معاملات کی گتھیوں کو اور الجھا ہی دیا لیکن سلجھا نہ سکے۔ بڑے بڑے فلاسفروں نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا کہ پہلو دار الفاظ کے انبار لگائے اور انسانوں کے گروہوں کو شک و تذبذب میں گرفتار کرکے انہیں جھگڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بڑے بڑے صناع کاریگر اور سائنسدانوں نے جس قدر انسانیّت کو فلاحِ ذاتی سہولتیں مہیّا کیں ان سے زیادہ ان کی ہلاکت اور تباہی کا باعث بن گئے۔ جن لوگوں کو دنیا پر انکشافات جدیدہ کے ذریعے احسان کرنے کا دعوٰی ہے ان کے جبڑوں سے بھی زخمی انسانیت کا خون ٹپک رہا ہے۔ مغرب کی جو تہذیب بلند بانگ دعووں کے ساتھ وجود میں آئی اس نے انسان کو تباہ کرنے کے لیے اپنی تجربہ گاہوں کی ہر تجرباتی نلکی کو وقف کر دیا اور اسے موت کے انجکشن دینے کی فکر میں دن رات ایک کر دیئے۔ علم و دانش کے یہ سارے مدعی انسانیت کی آہوں اور فریادوں کے سوا اور کچھ حاصل نہ کر سکے۔ اس لیے کہ ان میں سے کسی نے بھی فلاحِ انسانیت کا کوئی عالمگیر پروگرام پیش نہیں کیا۔ اپنی صفات کے لحاظ سے وہ سب یک طرفہ اور جانبدار نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی معاشیات میں الجھ گیا ہے تو انسانی زندگی کے دوسرے تمام شعبوں کو نظر انداز کر گیا ہے کسی نے سیاست کو لیا ہے تو معاشرت اس کی نظروں سے اوجھل ہے کوئی اجتماعیات کا ماہر ہے تو انسانی انفرادیت سے قطعی بے بہرہ ہے غرض ان سب کو حالاتِ زمانہ اور تقاضائے وقت نے پیدا کیا۔ انہوں نے خود حالات کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں ڈھالا۔ بلکہ جب مخصوص حالات پیدا ہوگئے تو انہوں نے آگے بڑھ کر ان حالات سے فائدہ اٹھایا۔ انہیں ہم تاریخ کی پیداوار (CREATURES OF HISTORY) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حضورؐ تشریف لائے تو حالات کا تقاضا وہ نہ تھا جو آپؐ نے پورا کیا۔ آپؐ نے حالات کو خود پیدا کیا خود اپنے کام کے آدمی تیار کئے۔ خود ان آدمیوں سے مخصوص اصولوں کی علمبرداری کا کام لیا اور خود ہی تاریکی کے پردوں کو پھاڑ کر ان میں سے صبحِ انسانیّت کو طلوع کیا۔ انہوں نے خود تاریخ کو بنایا اور اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا۔

مشرقِ بعید کے تمام مذاہب کے قدیم بانیوں نے انسان کے لیے ترکِ دنیا کو مکتی کا ذریعہ بنایا۔ یہ زندگی کے مسائل کا حل نہ تھا بلکہ ان سے فرار تھا۔ انبیاء کرام جو دنیا میں وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے۔ ان کا پیغام ہدایت بھی انہیں مخصوص قوموں کے لیے رہا جن کی طرف وہ مبعوث ہو کر آئے۔ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت موسٰیؑ، حضرت عیسٰیؑ ہر ایک نے ایک ہی انداز میں گم کردہ راہ لوگوں کو مخاطب کیا یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ "اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو"۔

ہر نبی اہر داعی حق نے ہر زمانے میں اسی طرح خطاب کیا اور انہیں لوگوں کو مخاطب کیا جو ان کے گرد ان کی قوم یا قبیلے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے لیکن سرورؐ کائنات نے دنیا کے تمام انسانوں کو بیک وقت مخاطب کیا - ان کو بھی جن تک آواز پہنچی ان کو بھی جو ان سے براہ راست مخاطب ہوئے اور ان کو بھی جو اس دنیا میں قیامت تک آدم کی نسل سے پیدا ہوتے چلے جائیں گے - ان کے خطاب اور ان کے پیغام کے تمام انسان مساوی طور پر مخاطب ہیں -

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ "اے لوگو" يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "اے لوگو جو ایمان لائے ہو" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کا پیغام نسلِ انسانی کے ہر فرد کے لیے ہے چاہے وہ زمین کے مغربی گوشے میں پیدا ہو یا مشرقی گوشے میں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی کو دنیا میں بھیجتے ہوئے یہی پیغام دیا کہ وہ کسی مخصوص گروہ کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو خدا سے ڈرانے والا اور سیدھی راہ دکھانے والا ہے -

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ؁	ہم نے تم کو دنیا کے آگے حق کی گواہی دینے والا سعادت انسانیت کی خوشخبری دینے والا اللہ کی طرف اس کے بندوں کو بلانے والا اور دنیا کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ نورانی بنا کر بھیجا -

دوسری جگہ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ؁	کیا ہی بابرکت ذات ہے جس نے اپنے بندے پر الفرقان نازل کیا تاکہ وہ قوموں کو اور ملکوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالموں کی ضلالت کے لیے ڈرانے والا بنے -

چنانچہ حضورؐ نے بھی حجۃ الوداع کے آخری خطبے میں جو انسانیت کے لیے تمام غیر الٰہی بندھنوں سے آزادی کا منشور ہے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے یہی فرمایا " جو یہاں موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچا دیں جو یہاں نہیں "

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کا پیغام زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالا ہے اور وہ ہر زمانے اور ہر نسل کے انسانوں کو بیک وقت ہدایت کی طرف بلاتا ہے -

ساری دنیا کے لیڈر کے لیے جن صفات کا بنیادی طور پر ہونا ضروری ہے وہ چار قرار دی جاسکتی ہیں۔

پہلی صفت یہ ہے کہ وہ کسی خاص قوم، نسل خاندان، رنگ یا طبقے کی سربلندی کے لیے نہ اٹھا ہو بلکہ مجموعی طور پر دنیا کے تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے اس نے کام کیا ہو۔ اس لیے کہ کسی مخصوص قوم یا ملک یا نسل کی سربلندی چاہنے والا شخص اس کے اپنے لوگوں کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے قابلِ تقلید نہیں ہوسکتا۔ جو شخص چین کے لیے ساری خیر خواہی کا جذبہ لے کر اٹھا ہو اس کی ذات سے ہم پاکستانیوں کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اسے اپنا لیڈر تسلیم کریں بلکہ اگر وہ چین کے باشندوں کی ترقی کے لیے ہمیں گرانا چاہتا ہو تو ہمیں اس سے نفرت ہوگی۔ اس لیے تمام قوموں کے انسان تو ایک شخص کو اسی صورت میں اپنا لیڈر مان سکتے ہیں کہ وہ کسی قوم کے فرد کو کسی دوسری قوم کے فرد پر کوئی ترجیح نہ دے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ اس لیڈر نے ایسے اصول پیش کیے ہوں جو دنیا کے تمام انسانوں کی نسل، قوم، رنگ اور ملک کی عصبیت سے بالاتر ہو کر رہنمائی کرتے ہوں اور ان کی فلاح کا طریقہ بتاتے ہوں۔

تیسرے یہ کہ اس کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ اس کا بتایا ہوا راستہ ہر زمانے کے انسانوں کے لیے مفید ترین راستہ ہو اس لیے کہ جو لیڈر زمانے کی گردش کے ساتھ از کار رفتہ ہو جانے والا ہو اسے دنیا کا ہادی نہیں کہا جاسکتا۔ دنیا کا ہادی وہی ہوسکتا ہے جس کی رہنمائی رہتی دنیا تک کارآمد ہو۔

چوتھے یہ کہ اس نے جو اصول پیش کیے ہوں وہ محض کسی فلسفی کا فلسفہ نہ ہوں بلکہ ان اصولوں پر اس نے حرف بحرف عمل کر کے بھی دکھایا ہو اس لیے کہ محض اصول پیش کر دینے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر تو ہوسکتا ہے لیکن ایک راہنما اور ہادی نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ شرائط ہیں جنہیں پورا کیے بغیر کسی انسان کو ساری دنیا اپنا لیڈر تسلیم نہیں کرسکتی۔ جب ہم یہ شرائط لے کر تاریخ کا دامن کھنگالتے ہیں اور دنیا کے تمام رہنماؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں حضورؐ کے سوا اور کوئی انسان ایسا نظر نہیں آتا جو ان شرائط پر پورا اترتا ہو حضورؐ کی زندگی پر سرسری طور پر بھی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کسی خاندان یا قوم یا نسل یا طبقے یا گروہ اور ملک کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی نگاہ میں تمام انسان بحیثیت انسان برابر تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی شائبہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس سے معلوم ہو کہ انہیں کسی خاص قوم یا خاندان یا گروہ سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے قومی، ملی، خاندانی یا نسلی بڑائی چھوٹائی کے تمام معیار توڑ کر تمام بنی نوع انسان کے سامنے ایک ہی معیار رکھ دیا۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ — جو تم میں پرہیزگار ہے اللہ کے نزدیک وہی معزز ہے۔

اس پیمانے پر دنیا کے ہر خطے کا انسان اپنے آپ کو جانچ سکتا ہے اور جس کا وزن اس میں زیادہ نکلے وہی معزز ہے چاہے وہ حبش کے بلالؓ ہوں یا روم کے صہیبؓ ہوں اسی لیے حضورؐ نے انسانوں میں بڑائی چھوٹائی کے وہ پیمانے مقرر کیے جن کا تعلق انسان کے جغرافیائی یا نسلی وجود سے نہیں بلکہ اخلاقی وجود سے ہے اور ان میں مساواتِ انسانی درجہ اوّل کا اصول ہے۔

فرمایا:

"اللہ کی ناراضگی سے بچو، جو خدا کے غضب سے ڈرتا ہے وہ پورا پورا کامیاب ہوا۔"

"پرہیزگاری مراتب کو بلند کرتی ہے۔"

پھر فرمایا:

"جاہلیت کے تمام مفاخر بند کیے جاتے ہیں۔"

نسل کی حد بندیاں ختم کرتے ہوئے فرمایا:

"پرہیزگاری کے سوا اور کسی چیز کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے پر فضیلت نہیں سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"

پھر فرمایا:

"اے لوگو نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔"

قرآن میں فرمایا گیا:

"اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تم میں وہی ہے جو پرہیزگار ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں۔"

اس طرح مکان و زبان اور قوم و وطن کی تمام حد بندیاں توڑ کر دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کیا گیا اور عالمی برادری بنانے کی دعوت دی گئی۔

پھر حضورؐ نے اپنی ساری قوت ان اصولوں کو نافذ کرنے میں صرف کر دی جو انسان کی فلاح کا بنیادی پتھر ہیں۔ کائنات کا نظام جس اصول پر قائم ہے اسی اصول پر انسانی زندگی کا سارا ڈھانچہ تعمیر کرنے کی جدوجہد میں حضورؐ نے زمانے بھر کی مصیبتیں سہیں۔ طائف کے بازاروں میں پتھر کھائے، جلاوطنی قبول کی۔ قوم نے جینا مشکل کر دیا۔ لالچ دیئے۔ دھمکیاں دیں۔ نظر بند کیا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ اگر تم میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند بھی رکھ دو تو میں اسلام سے باز نہ آؤں گا۔ آپ کے قتل کی سازشیں ہوئیں۔ لیکن آپ نے جس اصول کی حقانیت کا نعرہ لگایا تھا اور جس راہ کی طرف دنیا کو بلایا تھا اس پر قائم رہے یہاں تک کہ فلاحِ انسانیت کے ان عالمگیر اصولوں کی جڑیں قیامت تک کے لیے زمین میں گہری جما دیں۔

پھر آپ نے ۲۳ سال کی مختصر سی جدوجہد میں وہ سوسائٹی قائم کر کے دکھا دی جس کا خواب انہوں نے انسانیت کو دکھایا تھا۔ جس خواب کو پریشان کرنے کے لیے مشرکین اور دشمن اپنے سارے ہتھیار لے کر نکل آئے تھے وہ ایک واقعہ کی صورت میں عالم وجود میں آگیا اور عالمگیر بین الانسانی بنیادوں پر جس معاشرے کی تاسیس حضورؐ کے پیش نظر تھی وہ جاہلیت کے پردوں کو پھاڑ کر دنیا کے مطلع پر پہلی بار طلوع ہوا۔ اس میں حبش کے بلالؓ ایران کے سلمانؓ، فارس کے باذانؓ اور روم کے صہیبؓ بھی شامل تھے۔ اس معاشرے میں غلام آقا بن گئے جو ہمیشہ سے پست چلے آتے تھے وہ بلند ہو گئے جن کا کام صرف اطاعت کرنا تھا وہ فوجوں کے سالار ہو گئے اور جو حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ان کے اعزاز پر بڑے بڑے معززین کو بھی رشک آنے لگا۔

یہ معاشرہ خالص خدا کی بندگی کے اصولوں پر تعمیر ہوا۔ جس میں داخلے کی فیس صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تھی۔ اس طرح دنیا کے ہادی نے ایک نئی دنیا تعمیر کی اور اسے ایک نیا نظامِ اخلاق دیا، نیا نظامِ تعلیم، نیا نظامِ تمدّن، نیا نظامِ معاشرت و معیشت اور نیا نظامِ حکومت دیا۔ اور ساری دنیا کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھا دیا کہ پاکیزہ اصولوں پر ایک صالح نظام کس طرح تعمیر ہو سکتا ہے۔ اور وہ دنیا کو کتنی رحمت و برکت سے بھر سکتا ہے۔ درحقیقت حضورؐ نے دنیا کو ایک نیا انسان دیا۔ انسان کو بدل دینا ہی حقیقی انقلاب ہے۔

پھر جو گروہ حضورؐ نے ان نئے انسانوں پر مشتمل تیار کیا وہ صرف ان عالمگیر اصولوں کی بنیادوں پر ہی تیار کیا گیا اس کا تعلق نسل انسانی کے کسی خاص طبقے سے نہ تھا یا جغرافیائی حدود کی کسی خاص حد بندی سے نہ تھا بلکہ

وہ پوری دنیا کے انسانوں میں سے ایک اصول کے ترازو میں تول اور چھانٹ کر نکالے گئے اور ساری دنیا کی فلاح کے لیے انہیں مامور کیا گیا تھا۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ

اس طرح جو جماعت حضورؐ نے تیار کی وہ تمام نوعِ انسان میں سے چھانٹی گئی جس کے چھانٹنے اور برپا کرنے کا مقصد وہی تھا جو حضورؐ نے متعین کیا کہ وہ بھلائی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں اور اللہ پر ایمان لائیں۔ چنانچہ ہر اس گروہ کو جو ان اصولوں پر منظم ہو بھلائی کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو حضورؐ نے اختیار کر کے دکھایا۔ ہر غیر الٰہی حکم سے بغاوت، ہر غیر الٰہی اطاعت سے انکار، خدا کے ہر باغی اقتدار کی نفی اور خدا کے مکمل اقتدار اور قانون کے نفاذ کے لیے مسلسل جدوجہد چاہے اس جدوجہد میں کتنے ہی اُحد اور کتنے ہی حنین سامنے آئیں۔ چاہے اس کی راہ روکنے کے لیے اپنے ہی بھائی بیٹے اور عزیز نہ آجائیں۔ اس راہ کی ہر رکاوٹ کو حضرت عمرؓ کی طرح تلوار سے ہٹانا ہوگا۔

اس دور میں اس "اخرجت للناس" کے مخاطب آج کے مسلمان ہیں۔ ہمیں تک حضورؐ نے اپنا پیغام پہنچا دینے کا حکم دیا تھا اور پہنچانے والوں نے پہنچا دیا۔ آج ہمیں ہی دنیا کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا ہے لیکن اگر ہمارے ہاتھوں سے معروف دبے اور منکر پھلے پھولے تو پھر ہمیں اپنے آپ کو ہادیٔ برحق کے پیرو کہہ کر ان کے نام کو ناپاک کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

چوں نہ داری از محمدؐ رنگ و بو

از درود خود میالا نامِ او

آج حضورؐ کا اسوہ اور آپ کا پیغام ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر ہم انھیں دنیا کا آخری ہادی مانتے ہیں اور آپؐ کے لائے ہوئے قانون کو ہر زمانے میں دکھی انسانیت کا واحد علاج سمجھتے ہیں تو پھر ہمیں اس قانون کے نفاذ کے لیے اپنی زندگی کی ہر قوت صرف کر دینی چاہیے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں قید و بند کے مصائب اور دار و رسن کی سختیاں بھی کیوں نہ سہنی پڑیں۔ جو لوگ رسولؐ اکرم کی پیروی کا یہ حق ادا کریں حقیقت میں انہی کو مسلمان ہونا زیب دیتا ہے اور حضورؐ کی پوری پوری پیروی کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے اس سے کم تر دین کا کوئی ایڈیشن تیار کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانے کا نہ ہمیں حق ہے اور نہ ہی اس کی اجازت دی گئی ہے۔

العلم والایمان

شیخ یوسف القرضاوی

ترجمہ:۔ عبدالحمید صدیقی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دور کا انسان —— جو علم کے لحاظ سے بام عروج تک پہنچ چکا ہے —— دین و مذہب کے اصول وضوابط کا حاجت مند نہیں ہے۔ وہ مجرد علم کی بنیاد پر زندگی کا صحیح رخ متعین کرسکتا ہے اور اپنے معاملات میں نظم و توازن پیدا کر کے بہتر طور پر جی سکتا ہے۔ نیز وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ علم کا پیش کردہ نظریۂ زندگی عقلی و نفسیاتی لحاظ سے درست ہو گا جبکہ ان کے نزدیک مذہب، ایمان بالغیب جیسے غیر علمی نظریات سے ذہنوں کے اندر خلجان پیدا کرتے ہیں۔ دوسری چیز جو ان پرستارانِ علم کے لیے زیادہ کشش رکھتی ہے وہ ہے حرّیت فرد۔ ان کے خیال میں مذہب نے حلال و حرام کے نام سے فرد کی آزادی کو قدم قدم پر پامال کیا ہے لہٰذا جب انسان محض علم کی رہنمائی میں زندگی بسر کرے گا تو وہ اپنی آزادی کا تحفظ کر سکے گا۔ تیسری چیز جو ان کے نظریے کے مطابق پرستش حق میں جاتی ہے وہ حیاتِ دنیا اور اس کی ترقی کے لیے بھرپور کوشش ہے۔ کیونکہ دین، دنیا کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس کی نظر میں تمام اہمیت عالم آخرت کو حاصل ہے پس جب ایک چیز کی قدر و قیمت کا ہی دین قائل نہیں تو وہ اس کے حصول کے لیے زور کیسے دے سکتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی میں جب زندگی بسر ہو گی تو حیاتِ دنیا کی طرف انسان بھرپور توجہ دے سکے گا۔

یہ وہ تین امور ہیں جن کی بنیاد پر آج کا ذی علم انسان دین و مذہب سے گریزاں ہے اور ایمان کی افادیت کا منکر۔ ذیل میں ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ مذکورہ بالا دعاوی اپنے اندر کس حد تک صداقت رکھتے ہیں؟

علم اور ایمان کے مختلف دوائرِ عمل علم کی ایک حد ہے جہاں سے وہ آگے نہیں جا سکتا یعنی مادّہ اور محسوسات کی محدود دنیا۔ علم مشاہدات و تجربات کر سکتا ہے اور اپنے تجربات سے صحیح یا غلط نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ حس سے ماوراء اور مادّہ سے آگے کیا ہے؟ تو علم اس باب میں بالکل خاموش ہے۔ علم کی رسائی حقائقِ اشیاء کے ایک حصہ تک ہے یعنی اس کے ظاہری پہلو تک۔ باطن کے بارے میں علم کچھ نہیں جانتا۔ موجود اشیاء کیا ہیں اور کیسے ہیں —

مادی چیزوں کے بارے میں علم صرف انہی سوالات کا جواب دے سکتا ہے رہا یہ سوال کہ وہ کیوں ہیں تو اس کا جواب دینا علم کے بس کی بات نہیں یہ ایمان کا کام ہے۔ مادہ کا محرک اوّل کیا ہے؟ موجودات کی غایت الغایات کیا ہے؟ محسوسات و مشاہدات سے ماوراء کیا ہے؟ اور ظاہر اشیاء کا باطن کیا ہے؟ ان سب سوالات کا نہایت شافی جواب صرف ایمان کے پاس ہے۔ آدمی مر کے کہاں جاتا ہے؟ روح انسانی کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کا اس کائنات کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے؟ عالم افلاک اور سیاروں کو کس عظیم طاقت نے ایک زبردست انتظام میں جکڑ رکھا ہے؟ کیوں جکڑ رکھا ہے؟ اس کائنات کی ابتداء کب ہوئی اور اس کی انتہا کیا ہے ان تمام امور سے بحث صرف ایمان کرتا ہے علم و عقل کے پَر اس مقام پر جلنے لگتے ہیں۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجرد علم پر انحصار کرنے والے حقائق سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکتے اور ان کے لیے یہ ایمان ہی کے محتاج ہیں۔ تو جس علم کی بے چارگی و کوتاہی کا یہ عالم ہے اس کے پرستاروں کی ضلالت اور حقیقت سے بُعد کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

علم کے نتائج قطعی و یقینی نہیں ہوتے علم کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اس کے اخذ کردہ نتائج بلحاظِ صحت قطعی و یقینی نہیں ہوتے۔ تاریخ میں علم کے ساتھ بارہا یہ حادثہ پیش آیا ہے کہ ایک وقت میں علم نے جس چیز کو مسلمہ حقیقت قرار دیا بعد کے ادوار میں وہ از قسمِ اوہام و اباطیل سمجھی گئی۔ اسی سلسلہ میں ایک امریکی اسکالر[1] کے تاثرات ملاحظہ کیجیے۔ "علوم تجربہ شدہ حقائق کا نام ہے لیکن یہ حقائق انسان کے اوہام و خیالات سے بھی متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ نیز انسان کا ــ ان حقائق کے ملاحظہ و وصف و استنتاج میں دقتِ نظر سے کام نہ لینا بھی ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بنا بریں نتائج علوم ایک تو اشیاء کی کیفیت و کمیت تک محدود ہوتے ہیں دوسرے احتمالات سے شروع ہو کر احتمالات پر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی صحت یقینی ہے زیادہ سے زیادہ جو بات کی جا سکتی ہے وہ ان کا اقرب الی الصحت ہونا ہے تاہم خطا و احتمالِ خطا سے پاک وہ بہر حال نہیں ہوتے۔"

علمی پختگی ایمان کی طرف رہنمائی کرتی ہے علم سے مکمل رہنمائی حاصل کرنے کے مدعی حضرات نے علم کو ایمان کے بالمقابل لا کھڑا کیا ہے حالانکہ علم، ایمان کا حریف نہیں نہ اس کا مدمقابل ہے بلکہ ایمان کی طرف رہنمائی

[1] امریکی مصنف مارٹ استانلی کونجدن کا مقالہ کتاب اللہ یتجلی فی عصر العلم میں۔

کرنے والی ایک چیز ہے۔ تاریخ میں بہت سے راسخین فی العلم ایسے نظر آتے ہیں جن کے علم نے اُن کی حقیقت کی طرف رہنمائی کی اور وہ اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک برتر قوت ایسی موجود ہے جو اس کی تدبیر و انتظام فرما رہی ہے اور جس نے ہر چیز کو ٹھیک ٹھیک اندازے سے اس کے اصل مقام پر رکھا ہے۔ ایک عالم کے لیے اس امر کو جاننا دوسروں کی بہ نسبت آسان ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں کتنا ربط و نظم اور کتنا استحکام پایا جاتا ہے ۔ ارض و سماوات کی تخلیق میں، رات اور دن کے اختلاف میں، سمندر کے سینہ پہ رواں دواں کشتیوں اور جہازوں میں اور آسمان سے نازل ہونے والے پانی میں اللہ کی بے حد و بے حساب نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ہواؤں کی گردش میں، آسمانوں و زمین کے مابین مسخر بادلوں میں اور روئے زمین پر انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کے وجود میں جو اسرار و رموز پوشیدہ ہیں اس کا علم اسے ان کی مکمل معرفت بخشتا ہے اور نتیجۃً اس کا سر خدائے حی و قیوم کی چوکھٹ پر جھک جاتا ہے۔ استاذ ہوشل رقم طراز ہے " علم میں جیسے جیسے وسعت آتی ہے ایک ازلی و ابدی خالق کے وجود پر دلالت کرنے والی براہین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ خالق کہ جس کی قدرت کی کوئی حد و نہایت نہیں پس آج ماہرین حیاتیات، ریاضی دان، ہیئت دان اور ماہرینِ طبیعات نے علم کے جس عظیم الشان قصر کی تزئین کی ہے وہ درحقیقت اللہ وحدہ لا شریک کی عظمت کا قصر ہے "۔

اسی معنٰی میں ہربرٹ سپنسر لکھتا ہے :" علم اوہام و خرافات کی تردید تو کرتا ہے لیکن دین کی تردید کبھی نہیں کرتا۔ آج اکثر و بیشتر علمِ طبیعی میں الحاد و زندقہ کی روح سرایت کئے ہوئے ہے حالانکہ علمِ صحیح جو حقائق کی گہرائیوں میں جاگزین ہے اس روح سے قطعی طور پر بیزار ہے۔ علمِ طبیعی دین کے منافی نہیں بلکہ اس علم میں رسوخ پیدا کرنا اور اس کی طرف توجہ دینا تو ایک لحاظ سے عبادت کرنا ہے۔ ایک طرح کی تسبیح خوانی ہے ایسی تسبیح جو زبان کی حرکت سے نہیں بلکہ تجربہ و عمل سے تعلق رکھتی ہے "۔ ڈاکٹر ڈی نوی جو نہایت ذی علم طبیب ہیں علم طبیعی پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں " بہت سے سمجھدار اور بزعم خود نیک نیت لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لا سکتے۔ کیونکہ وہ اللہ کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں حالانکہ ایک علمی شوق رکھنے والا آدمی اللہ کا تصور زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہے جتنا کہ وہ بجلی کے بارے میں کئے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے بارے میں اس کے تصور کی نوعیت بالکل ناقص ہے۔ بجلی اپنا کوئی مادی وجود نہیں رکھتی بایں ہمہ وہ ایک لکڑی کے ٹکڑے سے (جو بہر حال مادی وجود رکھتا ہے) زیادہ بہتر طور پر اپنا وجود

حضرتِ انسان سے منوالیتی ہے" پس اللہ تعالیٰ کے مادّی وحسی وجود پر اصرار کرنا اور ماننے کے لیے اسے شرطِ لازم قرار دینا ایک غیر علمی بلکہ احمقانہ حرکت ہے۔

اہلِ علم کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علم، ایمان کا بدل کبھی نہیں بن سکتا بلکہ علمِ صحیح، ایمان کی صداقت کا شاہد عادل ہے ایمان کی منزل تک پہنچانے والی ایک روشنی ہے بجائے خود منزل نہیں۔

عقل ونفسیات کا معاملہ ایمان سے ہٹ کر جو نظریۂ زندگی خالص علمی بنیاد پر اختیار کیا جائے گا کہا جاتا ہے کہ وہ عقلی ونفسیاتی اعتبار سے درست ہوگا۔ لیکن واقعات اس امر کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور مغرب کے مادی تمدن نے بھی اس کی نفی کردی ہے۔ مغرب کے اہلِ علم کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے تجربی علم اور فنی ترقی کی بنیاد پر ایسا نظریۂ حیات اور ایسے اصولِ زندگی دریافت کرلیں گے جو عقلی ونفسیاتی لحاظ سے صحیح ہوں گے۔ برطانوی مورخ اور فلسفی ٹائن بی کی شہادت سنیئے۔" میں نے صنعتی فنون کی گہرائی میں ڈوب کر دیکھا تو محسوس کیا کہ ان انسانوں نے اپنی زندگی کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے اور انھوں نے پرانے دیوں کی جگہ یہ کچھ نئے چراغ خرید لیے ہیں۔ یہ گمراہی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ انسانوں نے اپنی جانوں کا سودا کرلیا اور بدلے میں سنیما اور ریڈیو لے لیے۔ اس تہذیبی تباہی —— جس کا سبب تازہ ترین لین دین تھا —— کا نتیجہ یہ نکلا کہ قلب وروح کی دنیا برباد ہو کر رہ گئی۔ ایسے ہی معاشرہ کو افلاطون نے خنزیروں کا معاشرہ قرار دیا تھا اور الڈس ہکسلے نے اسی کو" ایک نئے ظاہر فریب مگر تاریک باطن جہان" سے تعبیر کیا"۔ اس بحث کے اختتام پر ٹائن بی لکھتا ہے: "اب مغرب کی نجات اس میں ہے کہ اپنے نظامِ معیشت سے رخ پھیرے اور دین کی طرف رجوع کرے"۔ لیکن ٹائن بی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ اس انتقال کی صورت کیا ہو؟ وہ صرف یہ تاکید کرتا ہے "مغرب کا انسان صرف دین کی وساطت سے وہ روحانی بالادستی حاصل کرسکتا ہے جو مادی قوت سمیت اس کی سلامتی کی ضامن ہے جسے اس وقت مغربی صنعت کے مشینی دور نے نظر انداز کر رکھا ہے"۔ ڈاکٹر الیکس کریل جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تجربہ گاہوں میں تجربات کرتے گزارا ہے اور جو جدید علم کا وافر ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں رقم طراز ہیں "تعجب ہے کہ دماغی امراض دوسرے تمام امراض سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور شفاخانہ ہائے امراضِ دماغی پاگلوں سے بھرے پڑے ہیں اور نئے مریضوں کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں"۔ س۔ د۔ بیرس کا تجربہ ہے کہ

لہ کو کالن ولسن نے اپنی کتاب سقوط الحضارۃ میں اسے نقل کیا۔

نیو یارک کے ہر بائیس باشندوں میں سے ایک دماغی امراض کے ہسپتال میں داخلہ کا مستحق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کریل مزید لکھتے ہیں:" ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شفاخانوں میں پاگلوں کا علاج بڑی توجہ سے کیا جاتا ہے جن کی تعداد دق اور سِل کے مریضوں سے آٹھ گنا زائد ہوتی ہے۔ وہاں ہر سال چھیاسی ہزار کے لگ بھگ افراد دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر اسی رفتار سے لوگ پاگل ہوتے رہے تو لاکھوں کروڑوں بچے اور جوان جو اس وقت سکولوں اور کالجوں میں جاتے ہیں جلد یا بدیر انھیں نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے ہسپتالوں میں داخلہ لینا پڑے گا۔ ڈاکٹر موصوف ایسے ہی مزید کئی اعداد و شمار دینے کے بعد لکھتے ہیں۔" یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ دورِ جدید کا متمدن انسان کس تباہی سے دوچار ہے۔ اور جدید معاشرہ میں دماغی صحت کا مسئلہ کتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دماغی امراض ہی نہایت خطرناک۔ یہ دق سل سرطان اور گردہ و دل کے امراض سے زیادہ خطرناک ہیں۔ بلکہ تپ محرقہ، طاعون اور ہیضہ بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ پس اسی پہلو سے ہی یہ امراض لائقِ اعتنا نہیں کہ ان سے مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی ان کے فوری سدباب کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کی بنا پر وہ تفوق اور برتری متاثر ہو رہی ہے جو سفید فام نسلوں کو دوسری انواعِ بشر پر حاصل ہے۔

اسی سلسلہ سے تعلق رکھنے والی ایک خبر ملاحظہ فرمایئے، امریکہ کی پولیس نے باغی ادبا کی ایک انجمن کے دسیوں ارکان کو گرفتار کر لیا۔ اس کا سبب شعر و ادب پر مبنی ان کی قابلِ اعتراض تخلیقات و نگارشات نہ تھیں بلکہ ان کا عیبناک رہن سہن، ان کا بکثرت افیون کھانا اور ان نشہ آور اشیاء کے استعمال کا خطرناک طور پر دفاع کرنا تھا۔ ان کی گرفتاری پر انجمن ہی کے ایک ممبر ولیم رارک نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔" زندگی تلخ و ترش ہو گئی ہے اور لوگ مسلسل تعب و مشقت کا شکار ہیں اب اس نشہ کے روگ سے مفر کی کوئی صورت نہیں سوا اس کے کہ لوگ اپنے آپ کو دنیا کے خواب و خیال میں پہنچا دیں اور بے کاری و سستی کے مزے لوٹیں۔

یہ ہے وہ نفسیاتی و عقلی اعتبار سے صحیح دورِ زندگی جسے مغرب کے اہلِ علم نے دین و ایمان سے ہٹ کر دریافت کیا ہے اور جس پر جدید تہذیب و تمدن کو ناز ہے اور جس کے تلخ و تاریک نتائج کو دیکھ کر مغرب ہی کے سلیم الفکر دانشور چیخ اٹھے ہیں اور اپنے اربابِ حل و عقد کو دین و ایمان کی طرف لوٹنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

شخصی آزادی اور اس کے نتائج | ملحدانہ فکر کے علمبرداروں نے دین و ایمان کے خلاف اس لیے بھی بہت پراپیگنڈا کیا ہے کہ مذہب انسان پر بے جا پابندیاں عاید کرتا ہے اور قدم قدم پر اس کی آزادی کو سلب کر لیتا

ہے۔ اس کے مقابلے میں انہوں نے بنام علم جو نظریۂ زندگی پیش کیا ہے ان کا دعوٰی یہ ہے کہ اس میں آزادیٔ فرد میں کہیں مداخلت نہیں کی گئی۔

جہاں تک اُن حدود و قیود کا تعلق ہے جو عقیدۂ اسلام میں انسان پر عائد کی گئی ہیں وہ فرد کی آزادی میں مداخلت نہیں بلکہ فرد اور معاشرے کے حقوق میں توازن کا قیام ہے۔ ایک شخص اگر بلا روک ٹوک خواہشِ نفس پوری کرنا چاہے تو بلا شبہہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں۔ ایک اور صاحب اگر کسی کی جیب پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو ایسی آزادی کی بھی دین و ایمان میں کوئی گنجائش نہیں۔ فضائلِ اخلاق کو چھوڑ کر اگر کوئی آدمی رذائل اختیار کرتا ہے تو یقیناً اس کی بھی گرفت کی جائے گی۔ زبان کا غلط استعمال، طاقت کا ناروا مظاہرہ اور دولت کا ضیاع و بے جا صرف یہ سب ایسے کام ہیں جن کے ارتکاب کی اگر کھلم کھلا اجازت دے دی جائے تو معاشرتی زندگی کا امن و سکون غارت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پس جہاں تک اُس آزادی کا تعلق ہے جس سے انسانوں کے باہمی حقوق سلب ہو جانے کا خطرہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی آزادی دین و ایمان کی رو سے حرام اور ممنوع ہے۔ رہی وہ آزادی جو انسان کی شخصیت کی نشوونما کے لیے ضروری ہے اور جس سے دوسرے افراد کے حقوق اور مفاد ملک و قوم متاثر نہیں ہوتا اس آزادی کو نہ صرف یہ کہ مباح قرار دیا گیا ہے بلکہ اس کے تحفظ کی بھی پوری پوری ضمانت دی گئی ہے۔

اب آیئے ذرا اس معاشرے کی حالت کا جائزہ لیں جو خود کو علم و شعور سے بہرہ ور سمجھتا ہے اور جہاں نام نہاد شخصی آزادی پائی جاتی ہے اور دیکھیں کہ اس نے زندگی کی اعلیٰ اقدار کا کس بے دردی سے خون کر ڈالا ہے۔

(الف) ایک برطانوی سوسائٹی جو جنسی بے راہروی کا علاج سوچنے کے لیے معرضِ وجود میں آئی تھی اس کی رپورٹ یہ ہے کہ برطانیہ میں دس لاکھ افراد اور بسا اوقات اس سے بھی زیادہ لوگ جنسی بے راہروی میں مبتلا ہیں۔ (الاہرام، قاہرہ، مئی ۱۹۶۵ء)۔

(ب) سات کروڑ بیس لاکھ امریکی شراب پیتے ہیں جن میں سے دو کروڑ امریکی اپنے فرائض سے کوتاہی کے مرتکب ہو کر ہر سال حکومت کو کھربوں ڈالر کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ (الاہرام قاہرہ ۳ مئی ۱۹۶۵ء)۔

(ج) سویڈش عورتوں نے جنسی آزادی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرہ میں ملک کے ہر حصہ سے تعلق رکھنے والی خواتین نے شرکت کی جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی (اخبار الیوم

قاہرہ ۲۴ اپریل ۱۹۶۴ء)۔

(د) جرائم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پیشانی پر کلنک کا داغ ہیں۔ پولیس کے رجسٹر ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ تجارتی مقامات سے خرید و فروخت کے دوران لوگوں کی خرید کردہ اشیاء یا دوکانداروں کی چیزیں اچک لی گئیں۔ اور خواتین کے بیگ تک ان سے چھین لیے گئے۔ دوسری طرف ایوان ہائے عدالت سلب و نہب اور قتل و خونریزی کے مجرموں سے معمور ہوتے ہیں۔

۔ امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک جو علوم و معارف اور تہذیب و تمدن کا گہوارا سمجھے جاتے ہیں کا حال یہ ہے کہ رہائشی علاقوں میں نصف سے زائد لوگ غروب آفتاب کے بعد گھروں سے باہر نکلتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں۔ اور ایک ثلث کے قریب ایسے حضرات ہوتے ہیں کہ قبیلے میں کسی اجنبی کو دیکھتے ہی جن کے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ اور آبادی کا ایک خمس وہ اصحاب ہیں جو خوف و اضطراب کے مارے نکل بھاگنا چاہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کدھر جائیں اور کہاں امن و سکون میسر آسکتا ہے؟ علاوہ ازیں ہر سال ان لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جو نقل مکانی کر جاتے ہیں یا اپنے گھروں اور موٹروں میں بندوقیں اور دوسرا آتشین اسلحہ رکھنے کے اجازت نامے حاصل کرتے ہیں۔ نیز حفاظت و نگہبانی کرنے والے موٹے تازے درندہ صفت کتوں کا وجود تو گھروں کی فطری ضرورت بن چکا ہے۔

یہ سب نتائج کس بات کے ہیں؟ نام نہاد شخصی آزادی کے۔ انارکی و بے راہروی کے اور عقیدہ و ایمان سے بے زاری کے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ بدعنوانیوں اور جرائم سے بھرپورا ایسے معاشرے کو کیا کوئی نسبت ہوسکتی ہے اُس پُرسکون اور خوشگوار معاشرے سے جسے عقیدہ و ایمان جنم دیتا ہے۔ جہاں کسی کی زبان اور ہاتھ دوسرے کے مال جان اور عزت پر حملہ آور نہیں ہوتا۔ جہاں چوری اور ڈاکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگ کامل یکسوئی اور اطمینان سے اپنے مال و اسباب سے بھری ہوئی دوکانیں کھلی چھوڑ جاتے ہیں۔ جہاں گھروں کے دروازوں کو تالا لگانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں ہر آدمی دوسرے کو بھائی سمجھتا ہے اور اس کی ہمدردی اور خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔

ایمان اور حیاتِ دنیا آخری سوال جو ایمان سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے والے لوگ کرتے ہیں یہ ہے کہ عقیدۂ ایمان، حیاتِ دنیا کے لیے سعی و جد و جہد کا قائل نہیں اس کی نظر میں دنیا کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور وہ تمام توجہ اخروی زندگی پر ہی مرکوز رکھتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہاں از سرِ نو شرح و بسط سے

دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک گذشتہ باب میں " ایمان اور اس کے مادی واقتصادی نتائج " کے زیر عنوان ہم اس پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایمان پر مبنی تعلیمات دنیا کی زندگی کے لیے بھی اسی طرح رہنما اصول ہیں جس طرح کہ آخرت کے لیے۔ دنیوی زندگی کے مسائل ومشکلات کا ان میں حل بتایا گیا ہے اور ان سے زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے پھر آخر اس سوال میں کیا معقولیت ہے کہ ایمان حیاتِ دنیا سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ زیر نظر کتاب " الایمان والحیٰوۃ " کے سینکڑوں صفحات میں جن امور کو زیر بحث لایا گیا ہے ان کا تعلق دنیا کی زندگی سے ہی تو ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حیاتِ دنیا اور اس کے سروسامان سے وہ مجنونانہ وابستگی کا قائل نہیں کیونکہ یہ چیزیں بہرحال ناپائدار اور فانی ہیں تاہم ایک دانا و بینا شخص کو زوال پذیر اور فنا انجام اشیاء سے ان کی افادیت کے پیش نظر جتنا تعلق رکھنا چاہیئے اور ان کے حصول کے لیے مناسب حد تک جتنی سرگرمی دکھانی چاہیئے ایمان اس کا ضرور قائل ہے اس سے زیادہ کا نہیں۔

رسائل و مسائل

(ملک غلام علی)

تعلیمِ قرآن اور خدماتِ دینیہ پر اُجرت کا جواز و عدم جواز

سوال :- ایک مسئلہ مطالعہ کے دوران میں بار بار ذہن میں کھٹکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے ذریعے سے حل ہو جائے۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ کے صحابہ کرام کی ایک جماعت ایک آبادی کے قریب سے گزری جس میں ایک شخص کو سانپ یا بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ ان میں سے ایک صحابی نے چند بکریاں لینا طے کیا اور مریض پر سورۂ فاتحہ پڑھی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ دوسرے صحابہ نے بکریاں لینے پر اعتراض کیا۔ پھر یہ لوگ مدینہ پہنچے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پورا واقعہ بیان کیا تو آنحضورؐ نے فرمایا: ان احق ما اخذ تم علیہ اجراً کتاب اللہ۔ اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث حضرت عبادۃؓ نے روایت کی ہے: قال قلت یا رسول رجل اھدی الیّ قوسا من کنت اعلمہ الکتاب والقران ...... قال ان کنت تحب ان تطوق طوقاً من النار فاقبلھا۔ اس حدیث کی رو سے قرآن مجید سکھانے پر کمان جیسی معمولی اجرت لینا بھی موجبِ عذاب ٹھہرا۔

ان دونوں حدیثوں میں تطبیق و توفیق دینا میرے لیے مشکل ہے۔ اگر حدیث میں صرف ایک ہی حکم بیان ہوتا، خواہ ممانعت کا یا اباحت کا تو اسی کے مطابق عمل کیا جاتا، مگر بیک وقت دونوں کی پیروی کیسے ہو سکتی ہے؟ تعلیم قرآن سے ملتا جلتا معاملہ امامت، خطابت اور دینی تعلیم و تدریس کا ہے۔ پھر دینی تعلیم کی بھی مختلف صورتیں ہیں بعض اجتماعی اور بعض انفرادی۔ مثلاً ایک معلم یا قاری کسی شخص کے گھر پر اُسے یا اس کے بچوں کو قرآن مجید پڑھاتا یا قرأت سکھاتا ہے اور اس پر اپنا وقت لگاتا اور محنت کرتا ہے تو کیا اس معلم کے لیے گھر والوں سے کوئی معاوضہ لینا حرام ہوگا؟ بظاہر یہ

بڑا مشکل اور ناقابل عمل نظر آتا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس بارے میں مذکورہ احادیث کا مدعا و منشا صحیح طور پر واضح کیا جائے۔

جواب: جو اہلِ علم کتاب اللہ اور علوم دینیہ سکھانے یا کوئی دوسری دینی خدمت بجالانے میں وقت اور قوت صرف کرتے ہیں، علمائے سلف کا ان کے بارے میں تقریباً اتفاق ہے کہ وہ معروف طریق کے مطابق ان خدمات کا اجر و معاوضہ لینے کے شرعاً مستحق ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ عبادات پر اُجرت لینا جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن متاخرین حنفیہ کے فتوٰی کے مطابق امامت، خطابت اور تعلیم قرآن پر مادی معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے اور اس پر اجرت لینے کی جس حدیث کا ذکر آپ نے کیا ہے وہ بخاری کتاب الطب اور کتاب الاجارہ میں وارد ہے۔ اس کے راوی حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوسعیدؓ خدری ہیں۔ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت جو ابواب الاجارہ میں ہے، اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصحاب کرام ایک سفر پر روانہ ہوئے حتٰی کہ وہ عربوں کے ایک قبیلے کے ہاں پہنچے اور ان سے طعامِ ضیافت کے طالب ہوئے مگر انھوں نے میزبانی سے انکار کر دیا۔ اس قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا۔ قبیلے والوں نے ہر جتن کیا مگر کوئی تدبیر فائدہ مند نہ ہوسکی۔ چنانچہ وہ صحابہ کرام کے پاس آئے کہ شاید ان کے پاس کوئی علاج ہو۔ انھوں نے کہا کہ اے اہل قافلہ ہمارے سردار کو زہریلے جانور نے کاٹ کھایا ہے اور کوئی چیز کارگر اور نافع نہیں ہوئی۔ کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی علاج ہے۔ قافلے کے ایک فرد نے کہا ہاں، خدا کی قسم میں جھاڑ پھونک کرتا ہوں، لیکن خدا گواہ ہے کہ ہم نے تم سے کھانا مانگا اور تم نے انکار کر دیا۔ پس میں اس وقت تک دم نہیں کروں گا، جب تک تم اس کا معاوضہ ہم سے طے نہ کرو گے۔" چنانچہ انھوں نے بکریوں کا ایک گلہ عوض میں دینے کا معاہدہ کیا۔ پھر ان صحابیؓ نے سورۂ فاتحہ پڑھ پڑھ کر دم کرنا شروع کر دیا تو مارگزیدہ اس طرح ہوگیا گویا اس کے بند کھول دیے گئے ہیں اور وہ بلا تکلف چلنے پھرنے لگا۔ اس کے بعد اہل قبیلہ نے بکریاں ان کے حوالے کردیں۔ صحابہ کرام میں سے بعض نے کہا کہ انہیں آپس میں تقسیم کرلو مگر دم کرنے والے صاحبؓ نے کہا کہ ابھی ایسا نہ کرو۔ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پورا ماجرا بیان کریں گے، دیکھیں، آپ کیا فرماتے ہیں۔ پس وہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور واقعہ سنایا۔ آنحضورؐ نے فرمایا، اچھا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس طرح دم کیا جاتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: تم لوگوں نے ٹھیک کیا اور

مسکراتے ہوئے فرمایا کہ انہیں تقسیم کر لو اور میرا بھی حصہ لگاؤ۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احق ما اخذتم علیہ اجراً کتاب اللہ۔

اللہ کی کتاب اس کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس پر معاوضہ حاصل کرو۔

اس حدیث کے بارے میں بعض سوالات و اشکالات ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں لیکن وہ لاینحل نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس واقعہ کا تعلق تعلیمِ کتاب سے نہیں ہے، جن لوگوں سے بکریاں لی گئیں وہ مہمان نوازی کی صفت سے عاری تھے، ان کے مسلمان ہونے کی بھی تصریح نہیں ہے اور صحابہ کرام اس وقت مسافرت و احتیاج میں مبتلا تھے۔ اس لیے یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس سے تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کا عمومی اور علی الاطلاق جواز کیسے ثابت ہوگا؟ جامعین حدیث میں سے اکثر حضرات اس حدیث کو اجارہ، طب اور رقیہ وغیرہ کے ابواب میں لائے ہیں جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس قصے کا تعلق دینی تعلیم و تعلم سے نہیں ہے۔ مگر ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے بہر حال یہ تو ثابت ہے کہ آیاتِ قرآنی کے استعمال کے عوض میں مادی منفعت پیشگی طے شدہ معاہدے کے تحت حاصل کی گئی۔ اس کے حاصل کرنے والے صحابہ کرام شریعت کے اوامر و نواہی کے مکلف تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے کو جائز قرار دیا، بلکہ یہ اصولی بات ارشاد فرمائی کہ اگر تم دوسری خدمات کا معاوضہ لے لیتے ہو تو کتاب اللہ کے ذریعے سے اگر تم نے کسی کی حاجت روائی کی ہے اور اسے فائدہ پہنچایا ہے تو تم اس کا بدل لینے کے زیادہ حقدار ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اضطراری یا استثنائی صورت بھی قرار نہیں دیا، بلکہ اس میں سے خود اپنا حصہ بھی طلب فرمایا، گو مزاحاً ہی سہی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اس حدیث کا اطلاق براہِ راست تعلیمِ قرآن پر نہیں ہوتا، تب بھی اس سے بجا طور پر قرآن مجید پڑھانے پر اُجرت لینے کے حق میں بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کلام اللہ پڑھ کر پھونکنا ایک مریض کے لیے مفید ہو سکتا ہے اسی طرح اس کی تعلیم بھی ایک متعلم کے حق میں نافع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

استدل بہ الجمہور فی جواز اخذ الاجرۃ علی تعلیم القرآن۔

تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کے جواز میں اس حدیث کی رُو سے علمائے امت کی اکثریت نے استدلال کیا ہے۔

صحیح مسلم، کتاب الآداب، ابواب الطب میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس کی تشریح میں امام نووی فرماتے ہیں کہ اس سے سورۂ فاتحہ اور دیگر اذکار سے دم کرنے پر اجرت کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ وکذا الاجرۃ علی تعلیم القرآن (اور اسی طرح تعلیم قرآن پر اجرت بھی جائز ثابت ہوتی ہے)۔ پھر فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ، مالک، احمد، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور اور دیگر اسلاف کا مسلک یہی ہے۔ ان تصریحات کے بعد البتہ ایک اشکال مزید یہ باقی رہتا ہے کہ اگر ان روایات کی رو سے تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہو سکتا ہے تو پھر بعض لوگ جو کھانے یا پیسے کے لالچ میں میت کے لیے قرآن خوانی کرتے ہیں، یہ سب بھی جائز ہونا چاہیے۔ حالانکہ اکثر فقہا و محدثین کا مسلک یہی ہے کہ اس طرح اجرت پر قرآن پڑھنا فعل عبث ہے۔ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ قرآن خوانی جس کے حق میں کی جاتی ہے اسے کوئی دنیوی فائدہ یا نفع عاجل پہنچانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس سے اُخروی اجر و فلاح مطلوب و متصور ہوتی ہے، اسی لیے اسے ایصال ثواب کہا جاتا ہے اور ثواب سے مراد آخرت میں اجر و ثواب ہے۔ یہ تعلیم، اجارہ، معالجہ یا رقیہ وغیرہ کا معاملہ نہیں ہے۔ اس لیے اس میں فریقین کے پیش نظر دنیوی افادہ و استفادہ نہیں ہونا چاہیے اور اس کام کو حسبۃً للہ سرانجام دینا چاہیے۔ اس میں اگر دنیوی منفعت کے حصول کی نیت ہو گی یا اس کا شائبہ بھی ہوگا، تو یہ کارِ بے خیر ہو کر رہ جائے گا۔ بہرکیف ایصالِ ثواب کی خاطر قرأت قرآن کا مسئلہ اپنی الگ اور خاص نوعیت رکھتا ہے اور تعلیم قرآن، کتابت قرآن، طباعت و اشاعت قرآن کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اگر کسی مسلمان کو اللہ نے اتنی وسعت و استطاعت دے رکھی ہے کہ وہ ان قرآنی خدمات کے عوض میں کسی دنیوی اجر کا طالب و محتاج نہ ہو اور وہ اس خدمت کو بے مُزد للہ فی اللہ انجام دے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن وہ اگر اپنی سعی کا مادی بدل چاہے تو دنیا میں لے سکتا ہے اور اس کے باوجود اگر اس کی نیت میں اخلاص و احسان ہے تو وہ آخرت کے اجر سے بھی ان شاء اللہ محروم نہیں رہے گا۔ امامت و خطابت کی نوعیت بھی یہی ہے۔ کوئی شخص اگر غنی ہے تو بہتر ہے کہ وہ یہ خدمت اعزازی طور پر بجا لائے لیکن وہ محتاج ہے تو معروف طریقے پر معاوضہ لے سکتا ہے۔ اگر امامت کبریٰ کا منصب سنبھالنے پر خلفائے راشدین نے بیت المال سے معاوضہ لیا ہے، تو امامتِ صُغریٰ کا معاوضہ کیوں ناجائز ہوگا؟ بحالات موجودہ اگر اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا جائے تو خدمتِ دین اور تعلیم کتاب کے کام میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک بہت بڑی قباحت ہے جس سے بچنے کے لیے چھوٹی اور تنزیہی قباحت و کراہت کو نظر انداز کیا جائے گا۔ علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں۔ لولم یفتح لھم باب التعلیم بالاجر

لذهب القرآن (اگر تعلیم پر اُجرت کو جائز نہ کیا جائے تو قرآن مجید بھلا دیا جائے گا)

اس کے بعد اب اس روایت کو لیجیے جس میں تعلیمِ قرآن کے عوض میں ایک کمان تک لینے پر شدید وعید وارد ہے۔ مشکوٰۃ، کتاب الاجارہ میں بلاشبہہ یہ حدیث اسی طرح نقل کی گئی ہے کہ حضرت عبادہؓ بن صامت کو تعلیمِ قرآن کے بدلے میں ایک کمان پیش کی گئی تو اس پر بھی آنحضورؐ نے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارے گلے میں آگ کا طوق ڈالا جائے تو اسے قبول کر لو۔ لیکن یہ حدیث ابوداؤد اور ابن ماجہ سے لی گئی ہے اور وہاں کچھ مزید تفصیل ہے جو مشکوٰۃ میں نقل کرتے وقت چھوٹ گئی ہے۔ ابوداؤد، ابواب الاجارہ میں حضرت عبادہؓ کے الفاظ یہ ہیں، علمت ناسًا من اھل الصفۃ القرآن (میں اہل صُفّہ کو قرآن پڑھاتا تھا)۔ بعینہٖ یہی الفاظ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی سخت وعید اصحابِ صفہ سے متعلق تھی اور ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کا یہ گروہ ایسا تھا جو بالکل بے در بے گھر تھا اور آسمان کی چھت کے نیچے ایک چبوترے پر ان کے شب و روز بسر ہوتے تھے۔ ان کی تعلیم کے لیے بیت المال یا اغنیاء کی طرف سے معاوضہ کی بات دوسری ہے لیکن معلّم کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ جو لوگ خدمتِ دین کے لیے ہمہ وقت ہمہ تن آمادہ رہتے تھے اور اپنے پاس کوئی مال و متاع نہ رکھتے تھے ان سے کوئی معاوضہ لیا جائے۔ جن صاحب نے کمان دی تھی ممکن ہے کہ ان کا واحد اثاثہ یہی ہو جس سے وہ جہاد فی سبیل اللہ یا غذائی جانور کے شکار کا کام لیتے ہوں تو اس سے محروم کر دینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر امام سیوطی اور بعض دوسرے محدثین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے اس لیے وہ حدیث صحیحین کے مقابلے میں مرجوح یا منسوخ مانی جائے گی۔ بعض نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حضرت عبادہؓ نے ابتداءً یہ کام محض نیت احتساب کی نیت سے اپنے ذمے لے لیا تھا، اس لیے اس پر اجر لینا جائز نہ تھا۔ صاحبِ عون المعبود شرح ابوداؤد میں یہ توجیہہ بھی کی ہے جو میں نے اُوپر درج کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اھل الصفۃ قوم الفقراء کانوا یعیشون بصدقۃ الناس فاخذ المال منھم مکروہ۔ (اہل صفہ فقراء کی جماعت تھی جو لوگوں کے صدقات پر اوقات بسر کرتی تھی، پس ان سے مال لینا ناجائز تھا)۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ جو حضرات تعلیمِ قرآن یا کوئی دوسری دینی خدمت انجام دیتے ہیں اور اس میں اپنا وقت اور دماغ صرف کرتے ہیں اگر وہ غنی ہیں اور تقویٰ و احتساب کے طور پر کوئی مالی یا مادی اجر نہیں چاہتے تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے جس پر ان شاء اللہ آخرت میں بے حد و حساب اجر ملے گا۔ لیکن جو لوگ فراخ دست نہیں اگر حکومت یا عام معاشرہ ان کی کفالت کا انتظام کرے یا دینی استفادہ کرنے والے لوگ یا ان کے اولیاء خود دانہیں کوئی معین یا غیر معین معاوضہ دیں تو اس کا لینا اور دینا شرعاً حدِ جواز میں آتا ہے۔ اس پر علمائے اُمت کا قریب قریب اجماع و اتفاق ہے۔

مطبوعات

مکتوبات صدی (جلد اوّل و جلد دوم) از حضرت مخدومِ جہاں سلطان المحققین شیخ شرف الحق والدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ
مرتب و ناشر:- سید محمد نعیم ندوی - کوارٹر نمبر $\frac{5}{B}$ یونٹ نمبر ۶ شاہ لطیف آباد،
حیدر آباد (پاکستان)
قیمت: پہلی جلد پانچ روپے - دوسری جلد دس روپے -

حضرت شیخ احمد یحییٰ منیری کے مکتوبات کا مجموعہ رُوحانی فیض کا ایک لازوال سرچشمہ ہے، آپ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں مقام مُنیر ضلع پٹنہ میں ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے، بہت جلد آپ نے تمام علومِ دینی پر کامل عبور حاصل کر لیا، اُن کی روحانی عظمت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا - آپ نے مجاہدہ اور ریاضت میں بھی کمال حاصل کیا، پھر آخر دم تک روحانی فیضان کا سلسلہ جاری رہا -

زیرِ نظر دو جلدوں میں جلد اوّل تو فارسی زبان میں ہے اور تمام مکتوبات اپنے ایک مرید خاص قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں - وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ مرید خاص اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں حضرتِ مخدومِ جہاںؒ کی خدمت میں حاضر رہنے سے معذور تھے اس لیے اُن کے اصرار پر ان کے رشد و ہدایت کے لیے یہ غیر فانی مکتوبات تحریر کیے گئے -

دوسری جلد کا اردو میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے اس کے ساتھ فارسی متن نہیں ہے اور پہلی جلد میں صرف فارسی متن ہے اردو ترجمہ نہیں -

ان مکتوبات میں حضرت مخدوم جہاںؒ نے تصوف، طریقت اور شریعت کے اسرار و رموز بڑے دلکش انداز میں بیان فرمائے ہیں - ہر مکتوب روحانیت کا خزینہ ہے - مکتوبات کے کچھ عنوانات یہ ہیں، توحید، توبہ، کرامت و استدراج، کشف، سالک و مجذوب، اصل تصوف، گفتار و رفتار، عشق و محبت، تقویٰ، اسرار قضا و قدر، لباس، وعدہ، نفس و خواہش وغیرہ وغیرہ - آپ نے طریقت، شریعت

اور تصوف کی رو سے حیات و ممات کے راز ہائے سربستہ ایسے عالمانہ انداز میں منکشف کیے ہیں کہ بے اختیار دل و دماغ میں اُتر جاتے ہیں۔

اسلامی ریاستوں کی دولت مشترکہ COMMON WEALTH OF MUSLIM STATES	تالیف: چوہدری نذیر احمد خان شائع کردہ: فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور قیمت: -/۱۵ روپے صفحات۔ ۲۱۰

زیر تبصرہ کتاب، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، پان اسلام ازم کی ایک دیرینہ آرزو کو نہ صرف بیدار کرتی ہے بلکہ اس کی تکمیل کے لیے نشانِ راہ کا بھی کام دیتی ہے۔ کتاب کے فاضل مصنف جو برسوں سے دنیائے اسلام میں اتحاد و اتفاق کی دعوت دے رہے ہیں، نے بڑے قرینے کے ساتھ ان امکانات کو بیان کیا ہے، جن سے مسلمانوں کے مابین رشتہ اخوت مستحکم ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی ایک عالمی تنظیم کے قیام کی ضرورت بیان کی ہے، پھر اس کے قیام کے راستے میں جو موانع حائل ہو سکتے ہیں اُن کی نشاندہی کر کے ان موانع کو دور کرنے کی عملی تدابیر بھی بیان کی ہیں۔ اِن کے بعد اتفاق و اتحاد کے بارے میں بڑے اختصار کے ساتھ اسلامی تعلیمات کا ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں جو متعدد کوششیں ہوئی ہیں ان کا خاکہ پیش کیا ہے۔

پوری کتاب معلومات افزا اور فکر انگیز ہے مگر اس کا مطالعہ کرتے وقت ایک خیال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ مسلم ممالک میں جب تک فکری ہم آہنگی پیدا نہ ہو گی اس وقت تک اُن کے درمیان اتفاق و اتحاد کس طرح پیدا ہو سکے گا۔ دنیائے اسلام اِس وقت مختلف اور متضاد خیالات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ کوئی حصہ اشتراکیت کی زد میں ہے تو کسی حصے پر سرمایہ دارانہ نظام اپنی ساری قہرمانیوں کے ساتھ مسلط ہے، کوئی امریکہ کا دست نگر ہے اور کوئی روس کا حاشیہ بردار۔ فکر و نظر کے اِس وسیع اختلاف کے باوجود ان کے درمیان اتفاق و اتحاد آخر کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس فطری سوال کا کوئی جواب فراہم نہیں کیا۔

(بقیہ اشارات) مشرقی پاکستان کا حشر دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی ملت دشمن کارروائیوں اور مذموم مقاصد کے بارے میں اب بھی ملک کا کوئی بہی خواہ اگر کسی خوش فہمی کا شکار ہے تو اس کی عقل کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے کیونکہ سقوطِ ڈھاکہ تو ایک ایسا دلفگار حادثہ ہے جس سے دوچار ہونے کے بعد پاکستان کے ہر خیر خواہ کو خواب غفلت سے بیدار ہو جانا چاہیئے تھا لیکن حالات اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ ہم اسی غفلت کا شکار رہنے پر مصر ہیں جس کا شکار ہونے کی وجہ سے ہم پہلے بھی تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہے کہ یہاں اسلامی قومیت کے آفاقی تصور کی جگہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے محدود تصورات کو بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اُبھارا جا رہا ہے اور جو لوگ یہ کام سرانجام دے رہے ہیں ان کے حوصلے اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ لیاقوفات ایک انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ اس طبقے کے ایما پر تو نہیں کیا جا رہا جس کے ہاتھ میں اس وقت ملک کی عنانِ اقتدار ہے اور جو قسمیں کھا کھا کر ملک کی سالمیت کا یقین دلاتا رہتا ہے۔ مسندِ اقتدار کے پجاری جس شخصیت کے ساتھ چاہیں پاکستان کی بقا وابستہ کر کے صاحبِ اقتدار کو خوش کرتے رہیں لیکن اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ کسی ملک اور قوم کی بقا کسی مخصوص فرد سے وابستہ نہیں ہوتی کیونکہ افراد تو آنے جانے والے ہوتے ہیں۔ پاکستان جب معرضِ وجود میں آیا تو قائداعظم اور پاکستان لازم و ملزوم تصور کیے جاتے تھے، ان کی وفات کے بعد پاکستان کی زندگی کو لیاقت علی خان کے ساتھ وابستہ کیا گیا پھر صدر ایوب مرحوم کے حاشیہ نشینوں نے عوام کے اندر یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کی کہ پاکستان کا وجود فیلڈ مارشل صاحب کے اقتدار کا رہینِ منت ہے اور اگر وہ مسندِ اقتدار سے ہٹ گئے تو ملک کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اب وزیرِ اعظم بھٹو اور پاکستان دونوں لازم و ملزوم قرار دیئے جا رہے ہیں۔ آپ سوچیئے کہ کیا فانی انسانوں کے ساتھ کسی ملک اور قوم کی بقا وابستہ کی جا سکتی ہے؟ اچھے، زیرک اور دیگر اعلیٰ صفات کے حامل انسان بلاشبہ کسی قوم کے لیے بڑے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں اور اُس کی قوتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے میں اُن کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے لیکن کسی قوم کی زندگی کا انحصار افراد پر نہیں ہوتا۔ قومیں تو نصب العین کے ساتھ مخلصانہ وابستگی کے بل بوتے پر زندہ رہتی اور ترقی کرتی ہیں۔ جس قدر کسی قوم کا نصب العین ارفع و اعلیٰ ہوگا اور جس نسبت سے اُس نصب العین کی محبت اُس کے افراد کے سینوں میں جاگزیں

ہوگی اسی تناسب سے قوم مضبوط اور سربلند ہوگی۔ پاکستان کے لیے اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس کی قسمت کو کس فرد یا کس گروہ یا کس سیاسی جماعت کے ساتھ وابستہ کیا جائے بلکہ تاریخ کے اس نازک ترین دور میں اس کے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسے قوت و طاقت کے اس اتھاہ سمندر سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے کس طرح آمادہ کیا جائے جس سے منہ موڑ کر وہ ایک باعزت قوم کی حیثیت سے کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ ملتِ اسلامیہ کے لیے دینِ حق کی حیثیت روح کی سی ہے اور وہ اگر اس کے جسد سے نکل جائے تو پھر یہ قوم ایک بے گور و کفن لاش رہ جاتی ہے جس کی بوٹیاں نوچنے کے لیے سرخ و سفید سامراج کی چیلیں ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ ہم اس حقیقت کو اب اگر پوری طرح ذہن نشین کر کے اسلام کے مطابق عمل شروع کر دیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکتی لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر کے جو تدبیر بھی اختیار کی جائے گی وہ ہمارے لیے بربادی اور موت کا پیغام ثابت ہوگی۔

دوسری چیز جو ہماری تباہی کا سبب بنی ہے وہ ملک میں آمریت کو مسلط کرنے کی سخت عاقبت نااندیشانہ کوشش ہے۔ پاکستانی قوم جس کے اندر ہم اپنی حماقتوں سے ابھی تک وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل یا دوسرے لفظوں میں اسلامی قومیت کا واضح شعور اور احساس پیدا نہیں کر سکے، کے بارے میں اس ملک کے حکمرانوں کو بڑا محتاط رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک کے عوام اس وقت جذباتی خلا کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک زندگی کی اُن اعلیٰ اقدار سے لذت آشنا نہیں ہوئے جن کی روشنی میں مادی مفادات بالکل ماند پڑ جاتے ہیں اور ارفع اقدار کے حاملین ملک کے اجتماعی مفاد کے لیے بڑی سے بڑی مادی منفعت سے بخوشی دست بردار ہونے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ موجودہ حالات میں جبکہ قوم اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اپنے اصل نصب العین سے دن بدن دور ہوتی جا رہی ہے اور ملک کا ہر طبقہ اور گروہ اپنے حقوق اور مفادات کے بارے میں غیر معمولی طور پر حساس بنتا جا رہا ہے ملک کے حکمرانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک میں جمہوریت کو پوری تندہی اور خوش دلی کے ساتھ فروغ دینے کی کوشش کریں تاکہ کسی طبقے کے اندر احساسِ محرومی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس احساسِ محرومی نے ہی مشرقی اور مغربی پاکستان میں پہلے بھی جدائی پیدا کی ہے۔

اگر یہاں جمہوریت فروغ پالے تو ہر طبقے اور گروہ کو ملک کے انتظام و انصرام میں مناسب نمائندگی حاصل ہوگی اور اس طرح اس کے اندر احساسِ محرومی نے جو تلخیاں پیدا کر دی ہیں وہ دور ہو جائیں گی اور پوری قوم یک جان ہو کر اور پاکستان کو اپنے آقاؤں اور فرمانرواؤں کی جاگیر سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا ملک جان کر اور قومی آرزوؤں اور ملی اُمنگوں کا مرکز و مسکن سمجھتے ہوئے نئے عزائم اور نئے ولولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں اُتر پڑے گی۔

احساس محرومی کے خاتمے کے علاوہ ملک میں قیادت کا جو خلا محسوس کیا جا رہا ہے وہ جمہوریت کے ذریعے ہی بطریق احسن پُر ہو سکے گا اور کسی طالع آزما کو یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ اپنے جیسے انسانوں پر اپنی خدائی قائم کرے۔ آمریت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں جو شخص بھی اقتدار کے تخت پر متمکن ہوتا ہے وہ انا ولا غیری کے جذبے سے سرشار ہو کر امور مملکت چلاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ملک اور اس کے باشندے اور دوسرے وسائل تنہا اس کی ذات کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس لیے وہ جو چاہے کرے اور کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ ظاہر بات ہے کہ ایک فرد کی کبریائی کا سکہ کسی معاشرے میں اسی صورت میں چل سکتا ہے جب دوسرے تمام لوگ اس کے مقابلے میں نہایت پست نظر آئیں۔ اسی بنا پر جو شخص آمرانہ عزائم لے کر اُٹھتا ہے اُسے ہمیشہ اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ اُس کی ذات تمام اعلیٰ صفات کے پیکر کی حیثیت سے عوام میں نمایاں ہو اور دوسرے تمام افراد جو اپنے اخلاص، اپنے فہم و تدبر اور دیگر قائدانہ صلاحیتوں کی بنا پر عوام کی توجہ کا مرکز بن سکتے ہوں، اُن کی شخصیتوں کو اس حد تک مسخ کر دیا جائے کہ لوگ اُن سے نفرت کرنے لگیں اور اس طرح عوام کی نظروں کے سامنے صرف آمر کی ذات گرامی ہی رہ جائے جسے وہ یک سوئی کے ساتھ پوجتے رہیں۔ آمر کے لیے یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی اُبھرتی ہوئی شخصیت کو گوارا کرے جو اس کے اقتدار کے لیے کبھی خطرے کا باعث بن سکے۔ اس لیے آمر اپنے اردگرد صرف اُن لوگوں کو جمع کرتا ہے جو اس کے سامنے بونے نظر آتے ہوں تاکہ اُن کی موجودگی میں اس کا اپنا قد کاٹھ غیر معمولی حد تک نمایاں دکھائی دے۔ جس ملک میں آمریت کا دور دورہ ہوتا ہے وہاں کسی متبادل قیادت کے ابھرنے کے امکانات قریب قریب معدوم ہوتے ہیں اور جب عوام تنگ آ کر حکومت کرنے والے ہاتھوں کو تبدیل کرنے کی کوشش

کرتے ہیں تو یہ تبدیلی فطری انداز اور پُر امن طریق سے نہیں بلکہ آگ اور خون کے سمندر سے گزر کر یا بہت بڑے دھماکے کے ساتھ لائی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آمریت کے تحت زندگی بسر کرنے والے معاشرے کو کبھی چین نصیب نہیں ہوتا اور اس پر ہمیشہ خوف و ہراس کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ آمریت کے دیو استبداد نے جس طرح پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کو برباد کیا ہے اس سے کون ناواقف ہے لیکن اس کے باوجود ہم اس دیو کے تسلط پر بضد نظر آتے ہیں کیونکہ اس سے آمر کی بگڑی ہوئی آنا کو تسکین کا وافر سامان میسر آتا ہے۔

ابھی یہ سطور لکھی جا رہی تھیں کہ اخبارات میں ربوہ ریلوے اسٹیشن کا المناک واقعہ شائع ہوا۔ اس واقعہ کی جو تفاصیل منظر عام پر آئی ہیں اُن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کا نتیجہ تھا جو قادیانیوں کے مرکز میں اُن کے سربراہ کے مشورے سے تیار ہوئی تھی۔ نشتر میڈیکل کالج کے چند طلبہ کا ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگانے سے جھوٹی نبوت کے ایوانوں کے انہدام کا کوئی خطرہ تو پیدا نہ ہو گیا تھا کہ تین چار ہزار غنڈوں کو مسلح کر کے ایک منصوبے کے تحت میڈیکل کالج کے نہتے طلبہ پر حملہ کروایا جاتا۔ ہم اس حملے کی نہ صرف پُرزور مذمت کرتے ہیں بلکہ اسے امت مسلمہ اور پاکستان کے خلاف ایک ناپاک سازش سمجھتے ہیں۔ حکومت اور بعض سادہ لوح افراد قادیانیوں کو محض ایک فرقہ سمجھ کر اس کے ناپاک عزائم کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی مذہبی فرقہ نہیں بلکہ مغربی استعمار کی ایک خوفناک جاسوسی بٹالین ہے جس سے امت مسلمہ کو تباہ و برباد کرنے کا کام لیا جا رہا ہے، جو لوگ قادیانی امت کے مزاج، اس کے کام کرنے کے انداز، اس کی اجتماعیت اور جتھے بندی اور مسلمانوں کے بارے میں اس کے جذبات و احساسات سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا امت مسلمہ کے ساتھ کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس کی ساری وابستگی مغربی سامراج کے ساتھ ہے۔ مغربی سامراج نے ہی مذہب کے نام پر اس نیم عسکری تنظیم کو جنم دیا، اسی کی آغوش میں اس نے تربیت پائی اور اسی کی سرپرستی اور نگرانی میں اس نے امت مسلمہ پر شبخون مارے جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

قادیانیت اسلام کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ اسلام کے حصار میں وہ بارودی سرنگ ہے جسے اسلام دشمن طاقتوں نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ اس کی دیواروں کے نیچے بچھا رکھا ہے۔ علامہ اقبال کی دور رس نگاہوں نے امت مسلمہ اور قادیانیوں کے درمیان بُعد و بیگانگی بلکہ شدید مخاصمت اور مخالفت کو بھانپتے ہوئے آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر ہی یہ کہہ دیا تھا کہ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ قادیانیوں کو بہائیوں کی طرح امت مسلمہ سے ایک الگ اُمت قرار دے دیا جائے اور یہی ہمارے نزدیک اس مسئلے کا صحیح حل ہے۔ کسی اُمت کا ضمیر آنکھ سے زیادہ حساس ہوتا ہے جس طرح آنکھ اپنے اندر کسی نہایت باریک سے باریک چیز کو ایک ثانیہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتی اور اُس وقت تک اسے چین نہیں آتا جب تک کہ وہ اُسے نکال باہر نہ کر دے بالکل اسی طرح کوئی امت اپنے اندر کسی ایسے وجود کو گوارا نہیں کر سکتی جو اس کے اجتماعی ضمیر سے معمولی مغائرت بھی رکھتا ہو۔ اُسے چین اسی صورت نصیب ہو سکتا ہے جب اس کے اندر اختلال پیدا کرنے والی چیز اس سے الگ کر دی جاتی ہے۔ حکومت اگر اس مسئلے کو صحیح طور پر حل کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے صحیح اور معقول راستہ یہ ہے کہ قادیانیوں کو پاکستان میں فوراً غیر مسلم اقلیت قرار دے کر انہیں امت مسلمہ سے الگ کر دے۔ مسلمان برسوں سے اس بات کا تقاضا کر رہے ہیں اور خود قادیانی بھی انگریز کے دور اقتدار میں متعدد بار یہ مطالبہ کر چکے ہیں، لیکن انگریزی استعمار نے اپنے مخصوص سامراجی عزائم کی خاطر قادیانیوں کو مسلمانوں کے سینے میں خنجر کی حیثیت سے پیوست رکھنے پر اصرار کیا۔ لیکن اب جبکہ انگریز رخصت ہو چکا ہے اس خنجر کو امت محمدیہ کے جسد سے بہرصورت نکال دینا چاہیئے۔ اس سے مسلمانوں کو چین اور قادیانیوں کو تحفظ حاصل ہو سکے گا۔

ترجمان القرآن کے قارئین کرام کی خدمت میں گزارش

کاغذ کی قیمتوں میں حالیہ اضافہ کی وجہ سے ترجمان القرآن کی قیمت میں اضافہ بالکل ناگزیر ہو گیا ہے۔ ہمیں یہ اضافہ کرتے وقت شدید دُکھ محسوس ہو رہا ہے لیکن اس کے سوا ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں۔ اس بنا پر ہم اطلاعاً عرض کرتے ہیں کہ جولائی کے شمارے سے ترجمان کے ایک پرچہ کی قیمت ۱.۲۵ روپیہ اور زر سالانہ -/۱۲ روپے ہوگا۔

ناظم ادارہ

تفہیم القرآن
جلد دوم

طبع ہو کر آگئی ہے قارئین و ایجنٹ حضرات اپنی مطلوبہ تعداد سے جلد مطلع فرمائیں

ہدیہ ۳۸/- روپے

خطبات

از: مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

علیحدہ علیحدہ کتابی شکل میں

مختصر اور جامع۔ عام فہم۔ اسلوب بیان سادہ اور دل و دماغ کو اپیل کرنے والے جچے تُلے دلائل پر مشتمل مضامین۔ ارکانِ اسلام کی حقیقی روح کو سمجھنے اور احباب کو ان سے روشناس کرانے کے لیے اردو زبان میں اس سے بہتر مضامین اِن موضوعات پر شاید ہی دستیاب ہو سکیں۔

نفیس و عمدہ طباعت ــــ سفید کاغذ ــ دلکش سہ رنگا سر ورق

حصہ اول ــ	(اسلام)	۴/- روپے
حصہ دوم ــ	(صوم و صلوٰۃ)	۲/۵۰
حصہ سوم ــ	(زکوٰۃ)	۲/۰۰
حصہ چہارم ــ	(حج)	۱/۷۵
حصہ پنجم ــ	(جہاد)	۱/۲۵

اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست ادارہ کو لکھیں۔ مکمل سیٹ منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

اِدارۂ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور